جلیل قدوائی

چند اور اکابرؒ
چند اور معاصر

راس مسعود سوسائٹی
سی/۵- کوزی ہومز
گلشن اقبال، کراچی

چند اور اکابر،
چند اور معاصر

جلیل قدوائی

شائع کردہ

راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان
سی/۵۱ ۔ کوزی ہومز، گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰
(پاکستان)

سلسلۂ مطبوعات راس مسعود اکادمی نمبر ۱۷

سال اشاعت : ۱۹۹۳ء
مطبع : ایجوکیشنل پریس کراچی
قیمت : پچاس روپے

اکادمی کی دوسری مطبوعات

(مرتب : جلیل قدوائی)

۱۔ مجلۂ یادگار مسعود (اُردو۔ انگریزی)
۲۔ مرقعِ مسعود (" ")
۳۔ خیابانِ مسعود (اُردو)
۴۔ مسلۂ یادگار مسعود (اُردو)
۵۔ سفر جاپان (انگریزی)
۶۔ مشرقِ تاباں (اُردو)
۷۔ فانی : شخصیت اور حسنِ بیاں (")
۸۔ فوسٹر۔ مسعود لیٹرز (انگریزی)
۹۔ شعلۂ مستعجل (اُردو۔ انگریزی)
۱۰۔ سرسید علیہ الرحمتہ مع ضمیمہ سید محمود (")
۱۱۔ ریلمس آف گولڈ (انگریزی)
۱۲۔ وِھن انڈیا واز ڈوانڈڈ (")
۱۳۔ اوراقِ گل (اُردو)
۱۴۔ تجزیے اور تجربے (اُردو)
۱۵۔ شعراء و شعریات (اُردو)
۱۶۔ انشائے ہاشمی (اُردو)

فہرست

گزارش

کم و بیش سولہ (۱۶) برس ہوئے راقم نے "چند اکابر، چند معاصر" کے نام سے کوئی ڈیڑھ درجن ایسی "نادرِ روزگار" علمی، ادبی، قومی نیز دیگر لحاظ سے اہم شخصیتوں پر اپنے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا جن میں سے بیشتر سے راقم کو قریبی وابستگی اور ہم نشینی حاصل رہ چکی تھی جس کی وجہ سے وہ ان کی زندگی اور سیرت کے بہت سے اعلیٰ مگر پوشیدہ پہلو سامنے لا سکا۔

ایسے مضامین کو عرفِ عام میں "شخصی خاکے" کہا جانے لگا ہے اور محبِ عزیز مشفق خواجہ کے الفاظ میں "یہ سطحِ دریا کا نظارہ نہیں نہ دریا کی خبر لانے کا نام ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کے باطن کا سراغ اس طرح لگاتا ہے کہ ایک جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے"۔ نیز اُن کے خیال میں چونکہ راقم کے لکھے ہوئے "بیشتر شخصی خاکے ان افراد کے بارے میں ہیں جو ہماری تہذیبی اور علمی و ادبی زندگی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اس لیے ان خاکوں میں علمی و ادبی اور معاشرتی و سیاسی مسائل کی طرف اشارے ملتے ہیں جن سے متعلقہ افراد کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ... قدوائی صاحب کے خاکے ایک عہد کی بازیافت کا درجہ رکھتے ہیں"۔ جہاں تک راقم کو علم ہے یہ مجموعہ مخصوص سلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

راقم کا مقصد ان عالی مقام شخصیتوں کے کردار سے اپنے نوزائیدہ وطن کے نوجوانوں کو وطنِ عزیز کی بہتر خدمت کے لیے متاثر اور تیار کرنا تھا اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہو سکی یہ کہنا مشکل ہے مگر اس کی نیک نیتی مسلّم ہے۔

پچھلے دِنوں اُردو کی قدیم ترین اور راقم کی ہم عمر[1] انجمن ترقی اُردو

---

[1] انجمن: پیدائش ۱۹۰۳ء۔ راقم: پیدائش ۱۹۰۴ء

نے اس کے تو بیاً "چھپتر سال[۵] کی خدمات ادب کے صلے میں" نشان سپاس "عطا کرنے کے سلسلے میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں متعدد مقالے پڑھے گئے۔ مندرجہ بالا مجموعہ کے بارے میں پروفیسر نظر صدیقی نے فرمایا "اردو میں شخصی خاکوں کا شاید ہی کوئی مجموعہ اتنی اہم شخصیتوں پر مشتمل ہو۔ ان شخصیتوں پر یہ مصرعہ پوری طرح صادق آتا ہے "جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے"۔ دراصل شخصیات کی اس فہرست میں کئی شخصیتیں سرتاسر آفتاب ہی کی حیثیت رکھتی ہیں"۔ موصوف نے اس مجموعہ کا دوسرا اور زیادہ بہتر ایڈیشن شائع کرنے کی فرمائش کی۔

جلسے کے اختتام پر حاضرین میں سے کئی اور اصحاب نے بھی کتاب کے نئے ایڈیشن کی بات کی۔ مگر ہمارے سامنے راس مسعود سوسائٹی کے نئے منصوبے کا مسئلہ تھا اور صدر سوسائٹی جناب ایس ایس جعفری نے جو راقم کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اس تجویز کی تائید کی کہ اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت کے بعد ایسی ہی بلند پایہ اور قابل قدر شخصیتوں پر لکھے ہوئے دوسرے مضامین جو مرتب نہیں ہو سکے سوسائٹی کی طرف سے انھیں "چند اور اکابر، چند اور معاصر" کے نام سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ زیر نظر مجموعہ اس فرمائش کی تعمیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر پہلے مجموعہ میں علامہ اقبال، سر راس مسعود، سر شاہ محمد سلیمان، سر رضا علی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، بابائے اردو، پروفیسر حلیم، غلام السیدین، مولانا عبدالماجد جیسے اکابر شامل تھے تو تازہ مجموعہ میں لیاقت علی خاں شہید، نواب مزمل اللہ خاں، مولانا ظفر علی خاں، مسعود حسن رضوی ادیب، شاہ دلگیر، رازق الخیری، جوش صاحب، نیاز فتح پوری، شیخ محمد اکرام، چراغ حسن حسرت، خواجہ منظور حسین جیسی مستند شخصیتیں موجود ہیں، ہاں ایک فرق یہ ضرور ہے کہ پہلے

۵۔ راقم کا سب سے پہلا مضمون ورڈسورتھ کے ترجمہ "عبادت کا زمانہ" کے عنوان سے ۱۹۱۹ء میں رسالہ "صوفی" پنڈی بہاءالدین گجرات پنجاب میں مترجم کے نام میں "متعلم درجہ نہم" گورنمنٹ ہائی اسکول اناؤ" کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

مجموعہ میں سے

نہیں عیب کچھ ان میں، اور ہو بھی حسرت
تو ہم لوگ ہیں صرف آگاہ خوبی!

کے مطابق عموماً شخصیتوں کی تصویر کا ایک ہی رُخ نظر آتا ہے لیکن نئے مجموعہ میں بعض شخصیتوں کے دونوں رُخ سامنے آگئے ہیں مگر اس کا اطمینان رہے کہ ایسا عمداً نہ پہلے کیا گیا تھا نہ اس بار ہوا ہے۔ جیسا کسی کو دیکھا اور پایا ویسا لکھ دیا۔ اُمید ہے کہ زیر نظر مجموعہ بھی پہلے مجموعہ سے کم دلچسپ اور معلومات افزا نہ ثابت ہوگا۔ خدا کرے کہ عام ناظرین کے علاوہ یہ ہمارے نوخیز جوانوں کی دل چسپی کا بھی موجب ہو۔

آخر میں اس مجموعہ کی طباعت کے سلسلے میں مالی حوصلہ افزائی کے لیے ہم حسبِ سابق اکادمی ادبیات پاکستان کے شکر گزار ہیں۔

جلیل قدوائی
معتمد اعزازی، راس مسعود سوسائٹی
۱۷ر جون ۱۹۹۳ء

سی-۵، کرزی ہومز
سر شاہ محمد سلیمان روڈ
گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

جاتی نہیں ہے دل سے مرے یادِ رفتگاں
آنکھیں غمِ فراق میں رہتی ہیں خوں فشاں
پھرتا تلاش میں ہوں نہ جانے کہاں کہاں
ملتا نہیں جہاں میں اب اُن کا کہیں نشاں
علم و ہنر کے انجم و شمس و قمر گئے
کل تک جو ساتھ تھے وہ نہ جانے کدھر گئے[1]

(جلیل قدوائی)

---

[1] "سب رس" کے ایک "یادِ رفتگاں" نمبر سے ماخوذ

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

لیاقت علی خاں شہید

(۱)

قرارداد پاکستان منظور ہو چکی تھی۔ قواعد کی رو سے سرکاری ملازمین کو سیاست میں حصہ لینے یا سیاسی کارکنوں سے ربط ضبط رکھنے کی ممانعت تھی، سوا ان لوگوں مثلاً مرکزی اسمبلی کے بعض ملازمین کے جن کے لیے اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں منتخبہ اہل سیاست سے ملنا ناگزیر تھا۔ مگر ملکی حالات جس موڑ پر پہنچ چکے تھے، اس کے پیش نظر متذکرہ قواعد پر عمل درآمد کم و بیش قصۂ پارینہ ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے افسروں کے سیاسی لیڈروں سے تعلقات پیدا ہو چکے تھے اور ہندو مسلم ہر دو ملازمین اپنے قومی مفاد کے لیے جو کچھ ان سے ممکن تھا کر رہے تھے۔

میرے دوست مسٹر وزیر علی مرحوم حکومتِ ہند کے ملٹری اکاؤنٹس کے شعبہ میں افسر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے اپنے ملک میں اور ملک سے باہر بھی غیر معمولی ترقی کی۔ ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ سیاست کے خارزار میں الجھ گئے اور میں بدستور شعبۂ اطلاعات سے متعلق رہا ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در آغازِ عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

ان کی ایک قابل ذکر خصوصیت تھی کہ دوستی کرنے میں پہل کرتے۔ مجھ پر بھی وہ اپنا یہ وار چلا چکے تھے۔ ایک شام انھوں نے غالب روڈ، نئی دہلی میں واقع اپنی قیام گاہ پر ان دنوں کے آنریبل نواب زادہ لیاقت علی خاں، ڈپٹی لیڈر، آل انڈیا مسلم لیگ پارٹی، مرکزی اسمبلی کے اعزاز میں ایک شاندار عصرانہ دیا، جس میں حکومت ہند کے بہت سے افسر شریک ہوئے۔ میں بھی حاضر تھا۔ بالکل غیر رسمی تقریب تھی۔ یعنی اس کا سیاست سے تعلق تھا نہ ایڈریس اور تقریروں وغیرہ کا سلسلہ تھا۔ احباب نے آپس میں اپنے طور پر سیاسی معاملات پر بھی گفتگو کی ہو، وہ الگ بات ہے ورنہ سب نے دوستانہ ماحول میں گھوم پھر کر ایک دوسرے سے گپ شپ کی، کھایا پیا اور بس۔

تقریب کے خاتمہ پر نواب زادہ صاحب مسٹر وزیر علی کو اپنے ساتھ لیے باری باری سے ہر مہمان کے پاس تشریف لائے اور اس سے متعارف و مخاطب ہوتے۔ اس وقت انھوں نے بے شک مختصراً اور جلدی جلدی مسلم مفادات کی حمایت کے لیے احباب سے کہا۔ میری طرف بھی تشریف لاتے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میں شعبۂ اطلاعات میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر ہوں تو نسبتاً زیادہ دیر ٹھہرے۔ یاد نہیں آتا ڈان سے یوتھن جوزف جا چکے تھے یا جانے والے تھے۔ (کم از کم ہمارے شعبے میں وہ اس وقت تک نہیں آئے تھے) اور انھوں نے مجھ سے پوچھا :-

"کیا سرکاری حلقوں میں مسلم لیگ کی پالیسی کو جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھانے والا کوئی مسلمان اخبار نویس۔ جو ہماری مالی حالت کو دیکھتے ہوئے ایثار پیشہ بھی ہو آپ کے علم میں ہے ؟"

میں نے عرض کیا :-

"ایثار پیشگی کے بارے میں تو کچھ عرض نہیں کر سکتا مگر کیا آپ حضرات نے الطاف حسین صاحب سے (جو اُس وقت اسسٹنٹ پریس ایڈوائزر تھے) کوئی سلسلہ جنبانی کی ہے ؟"

ے اپنے زمانہ کے نامور مسلم دوست ہندوستانی عیسائی اخبار نویس جس اخبار میں جاتے اپنا مشہور کالم OVER A CUP OF TEA اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ڈان کے ابتدائی ایام میں وہ اس کے مدیر مقرر ہوئے تو اُن کا یہ کالم ڈان میں چھپنے لگا۔ عباسی مرحوم نے پاکستان میں اپنے ہفتہ وار اخبار STAR کراچی میں اسی مستعار عنوان سے اپنا کالم لکھا مگر بقول اکبر ؎

بڑھائی شیخ نے ڈاڑھی اگرچہ سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

والا معاملہ رہا۔ اُن کا اخبار جس کا نام بھی تقسیم سے قبل کے مسلم ہفتہ وار STAR کلکتہ سے مستعار لیا گیا تھا زیادہ دن نہ چل سکا۔ عباسی نے اسے پریس ٹرسٹ کو دینا چاہا تھا مگر اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی۔

ے۲ عرصہ ہوا کراچی کے ایک اخبار نویس نے ڈان میں الطاف حسین مرحوم پر اپنے مضمون

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس پر انھوں نے کچھ اس قسم کا جواب دیا جس سے اندازہ ہوا کہ الطاف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

میں اُنھیں تقسیم سے پہلے حکومت ہند کے "محکمۂ اطلاعات کا پریس ایڈوائزر" لکھا تھا۔ واضح ہو کہ پریس ایڈوائزر اور انفارمیشن بیورو کے دفتر ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے اگرچہ اُن کا انچارج جو وائسرائے کی کونسل کا ایک ہی آنریبل ممبر ہوتا تھا۔ (وزارتیں اس وقت نہیں تھیں) چنانچہ یہ دونوں محکمے پہلے سر سلطان احمد اور بعد میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران سر اکبر حیدری کے پاس تھے۔ ہر دو کے محکمہ جاتی انچارج علی الترتیب چیف پریس ایڈوائزر اور ڈائرکٹر پریس انفارمیشن تھے جو آنریبل ممبر کو جواب دہ تھے۔ ڈائرکٹر پریس انفارمیشن کا عہدہ بعد کو پرنسپل انفارمیشن آفیسر کہلایا۔ الطاف حسین مرحوم پر متذکرہ مضمون کی اشاعت کے کچھ دن بعد مسٹر این اسٹیفنس (اب آنجہانی) سابق ایڈیٹر اخبار "اسٹیٹسمین" کلکتہ نے جو اس سے پہلے حکومتِ ہند میں ہمارے نہایت درجہ دل نواز اور ہر دل عزیز ڈائرکٹر پریس انفارمیشن بیورو رہ چکے تھے ڈان میں مطبوعہ اپنے ایک خط میں لکھا "جہاں تک مجھے یاد آتا ہے آزادی سے فوراً پہلے ڈان کے لیے مدیر کی تلاش کے وقت وہ (الطاف حسین) دہلی میں حکومتِ ہند کے بحیثیت چیف پریس ایڈوائزر کے محکمہ کے اسٹاف پر تھے۔" مگر انھوں نے تسلیم کیا کہ شاید اُن کا حافظہ ساتھ نہ دے رہا ہو۔

غالباً اس وقت پاکستان اور شاید ہندوستان میں بھی میرے سوا اُس زمانے کا کوئی اور قابلِ ذکر اہلِ قلم یا صحافی جو اصلی صورتِ حال سے واقف ہو موجود نہیں، لہٰذا میرا یہ بیان تسلیم کرنا ہوگا کہ الطاف حسین مرحوم دہلی میں اسسٹنٹ پریس ایڈوائزر تھے۔ اس عہدہ پر کچھ دن رہنے کے بعد وہ دہلی سے بنگال واپس چلے گئے تھے۔ سرکاری ملازمت میں آنے سے پہلے وہ اسٹیٹسمین کلکتہ میں مسلمانوں کے حالات پر فرضی نام سے کالم لکھتے تھے۔ ڈان کے مدیر کی حیثیت میں وہ بنگال سے دوبارہ دہلی آئے تھے۔ میرے اس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صاحب ان کی نظر میں پہلے ہی سے تھے مگر معاملہ کے یکسو ہونے میں بعض موانع تھے۔

تقسیم ہند سے قبل دہلی میں نواب زادہ صاحب سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ پھر پاکستان بننے کا فیصلہ ہوگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری مرحلہ کے قریب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سرکردگی میں جنوب مشرقی ایشیا کمان قائم ہوئی جس کا ہیڈ کوارٹر دہلی مقرر ہوا۔ شہر میں جگہ کی قلت پہلے ہی شدید تھی۔ اب اس نئی کمان کے اتنے بڑے اسٹاف کے لیے جگہ نکالنے کی غرض سے حکومتِ ہند کے جو دفاتر آسانی سے دہلی سے باہر منتقل کیے جا سکتے تھے، کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ میں ان دنوں لاہور میں تھا جو اُن دو پبلسٹی کا مرکز قرار دیا گیا تھا ہندی پبلسٹی کا مرکز بے شک دہلی رہا مگر بنگالی، گجراتی اور تامل کے مراکز علی الترتیب کلکتہ، بمبئی اور مدراس مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں میری والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ اور مجھے نہ صرف مرحومہ کے فاتحہ اور عزاداری میں حصہ لینا تھا، بلکہ بہت سے ان دبے چھپے خانگی مسائل و تردّدات کو جو ایسے سانحوں کے بعد ابھر کر سامنے آجاتے ہیں طے کرنا بھی ضروری تھا۔ ان امور کے پیش نظر پارٹیشن کونسل کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں عارضی طور پر دہلی چلا گیا مگر وہاں پہنچ کر جو گزری اسے دل ہی جانتا ہے۔ مرحومہ کے وفات کے بعد کے مراسم میں شریک ہو سکا نہ وہ مسائل طے کر سکا جو سامنے تھے۔ کسی نہ کسی طرح اپنی اور بیوی بچوں کی جان اور عزت بچانے کی غرض سے باحالِ تباہ تیئس دن پرانے قلعہ میں رہا۔ پھر ہندوستان میں پاکستان کے پہلے ہائی کمشنر زاہد حسین مرحوم کے ساتھ کام کرنے کے بعد جب انھوں نے دولتِ پاکستان بنک کی گورنری کا چارج لیا اس وقت یعنی ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو ہوائی جہاز کے ذریعے وارد کراچی ہوا۔ اور اپنے محکمہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ ماسبق)

بیان کی تائید اسٹیفنس صاحب کے مذکورہ خط پر ادارتی نوٹ سے ہوتی ہے جو خود الطاف حسین مرحوم کے یادداشت پر مبنی ہے نیز یہ بھی واضح ہو کہ جس عصرانہ کا ذکر میرے اس مضمون میں ہے اس کے شرکا میں سے بھی شاید ہی آج کوئی حیات ہو۔ ادیب یا صحافی اس میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔

رجوع کیا۔[۱]

پاکستان میں جناب لیاقت علی خاں کی نہایت بیش قیمت اور مصروف زندگی کے دوران مجھے سرکاری طور پر ان کی خدمت میں متعدد بار حاضری کے مواقع نصیب ہوئے۔ کئی بار اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں عوامی یا سرکاری جلسوں میں یا عصرانوں یا رات کے کھانوں کی تقریبات میں جن میں سے چند کا انعقاد ان کے دولت کدہ واقع وکٹوریہ (اب عبداللہ ہارون) روڈ نیز دفتر یا ہال (موجودہ باغِ جناح) پر ہوا۔ ان سے شرف ہم کلامی و تبادلۂ خیال میسر آیا۔ ان کے پولٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خاں مرحوم میرے قدیم کرم فرما تھے۔ ان کے دفتر میں میری موجودگی کے دوران ان سے کئی بار غیر رسمی اور غیر متوقع ملاقاتیں ہوگئیں۔

یہاں موصوف کے بارے میں ایک واقعہ کا تذکرہ کروں گا جو میرے خیال میں ایک غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے جس سے ان کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو پر روشنی پڑتی ہے جو عام طور پر معلوم نہیں ہے۔ میری مراد اُردو زبان و بیان کے معاملے میں ان کے ذوقِ تجسس و احتیاط نیز ان کے فن و طریق خطابت سے ہے۔

موصوف نے "یوم پاکستان" کے موقع پر کراچی کے جہانگیر پارک میں عوام کے سامنے اپنی حکومت کی کارگزاریوں کا سالانہ تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی طرح ڈالی تھی۔ ان جلسوں کا سلسلہ میری یاد میں چودھری محمد علی کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے تک قائم رہا۔ جب عوام نے ایک سال انھیں سننے سے انکار کر دیا، یہ جلسے ختم ہوگئے اور وہ خود وزارت سے مستعفی۔ خیر تو پاکستان کی پہلی سالگرہ تھی۔ قائداعظم دولت پاکستان بینک کے افتتاح کے بعد اپنی افسوسناک آخری علالت کے سبب اس موقع پر زیارت سے کراچی تشریف نہ لاسکے تھے مگر انھوں نے اپنا معرکتہ آلارا اور نہایت حوصلہ افزا پیغام بھیج دیا تھا جو ان مشہور جملوں پر ختم ہوتا ہے:۔

"قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے۔ آپ بے حد و حساب وسائل کے مالک ہیں۔ آپ کے مملکت کی بنیاد

---

[۱] یہ داستانِ غم میرے انگریزی مجموعہ "When India was divided and other writings: شائع کردہ راس مسعود سوسائٹی (۱۹۷۷ء) کے ایک مضمون میں ملے گی۔

رکھی جا چکی ہے اور اب یہ آپ کا کام ہے کہ اس پر عمارت تعمیر کریں اور جتنی جلد اور جس قدر خوبصورت ممکن ہو تعمیر کریں۔ لہٰذا آگے قدم بڑھائیں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان زندہ باد!"

واضح ہو کہ اس پیغام کے مسودہ نگار نے دو جگہوں پر جیسا کہ اس زمانے میں ہم لوگ اپنے غیر معمولی جوش و خروش کی بنا پر کہا کرتے تھے، پاکستان، کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست" لکھا تھا۔ قائداعظم نے اپنے دستِ مبارک سے دونوں جگہوں پر ترمیم کر کے اس عبارت کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاستوں میں سے ایک" بنا دیا تھا۔ اس زمانے میں مصر کے شاہ فاروق نے پاکستان کے لیے ہمارے ان الفاظ کے استعمال کو اپنے ملک کے لیے توہین آمیز نہیں تو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا اور ہمارے سفیر مقیم قاہرہ (غالباً جناب حاجی عبدالستار سیٹھ) سے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اور قائداعظم ایک اہم مسلمان مملکت سے پاکستان کے تعلقات ناخوشگوار کرنے کے کسی طرح روادار نہ ہو سکتے تھے۔ اس واقعہ کا میں نے سید ہاشم رضا سے بھی ذکر کیا تھا اور انھوں نے میرے حوالے سے اس کا قائداعظم پر اپنے ایک مضمون میں بھی بہ وضاحت ذکر کیا ہے۔

جہانگیر پارک میں متذکرہ "یوم پاکستان" کے موقع پر لیاقت صاحب کی مفصل اور طولانی تقریر کا متن ہمارے شعبہ میں پہلے انگریزی میں تیار ہوا۔ بعد میں اس کا اُردو ترجمہ کیا گیا اور دونوں موصوف کے ملاحظہ کے لئے بھیج دیے گئے۔ یہ ہماری کوئی خاص کارگزاری نہ تھی۔ مختلف وزارتوں اور محکموں سے مفصل رپورٹیں طلب کی جاتی ہیں جن پر پبلسٹی کے نقطۂ نگاہ سے بشرط ضرورت مزید سوالات قایم کر کے پوری معلومات کے حصول کے بعد یا اُن کے خلاصوں کی بنیاد پر اس قسم کی تقریریں تیار کی جاتی ہیں۔ ہاں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اُن کی زبان ایسی ہو جو عوام کی سمجھ سے باہر نہ ہو، غلط نہ ہو اور اخبارات کے لیے قابل قبول ہو۔

ایک دن وزیراعظم کے ہاں سے ہماری طلبی ہوئی اور راقم اور ایس اے جواد صاحب اس زمانے کے پی آئی او اُن کی خدمت میں پہنچے معلوم ہوا

ان کے پرائیویٹ سیکریٹری آغا عبدالحمید نے جو خود اردو کے اچھے ادیب تھے، ترجمہ
کی غرض سے انگریزی تقریر کی ایک نقل اپنے طور پر مولانا عبدالحامد بدایونی کو
بھی بھیج دی تھی۔ شاید انھیں کچھ فائدہ پہنچانا مقصود رہا ہو مگر ہمیں خوشی ہوئی
کہ لیاقت صاحب نے ہمارا ترجمہ ہی پسند کیا۔ اس سلسلے میں مجھے اس امر پہ حیرت
ہوئی کہ موصوف نے ترجمے میں کئی مقامات پر نشانات لگا رکھے تھے اور ان کے
بارے میں ان سے خاصی بحث و تمحیص ہوئی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ کئی
جگہوں پر ان کی ترامیم زبان اور بیان کے اعتبار سے ہمارے ترجمے سے بہتر تھیں؟

اُن سے رخصت ہوتے وقت ہم نے اپنے سرکاری خوش نویسوں سے لکھا
کر اردو تقریر کا ایک مسودہ اُن کی خدمت میں بھیج دینے کا وعدہ کیا مگر انھوں
نے فرمایا تقریر کے دن ہمیں ایک اردو مختصر نویس کو ساتھ رکھنا ہوگا۔ اس وقت
تک ٹیپ ریکارڈنگ کا سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا اور انھوں نے فرمایا کہ تقریر کرتے
ہوئے مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے وہ کتابت شدہ مسودہ پر اچٹتی ہوئی نظر
ضرور ڈالتے جائیں گے مگر زور بیان اور جوش خطابت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ
وہ ذیلی موضوعات چھیڑ دیں یا اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر مضمون میں کچھ اضافے
کریں۔ ان حصوں کو تقریر میں شامل کرنے اور پریس کو بھیجنے کی ذمہ داری بھی ہماری
ہوگی۔

چنانچہ کراچی پولیس سے ایک اردو مختصر نویس طلب کیا گیا اور پہلے "یوم
پاکستان" کے موقع پر جہانگیر پارک میں ان کی طول طویل تقریر پریس کے لیے ان
صاحب کی مدد سے تیار کی گئی۔ اس طرح لیاقت صاحب کی کاپی تو ان کے پاس
تھی۔ ان کی تقریر کی پہلے سے صاف کی ہوئی ایک اور نقل میرے سامنے رہی۔
جہاں جہاں وہ نئے موضوعات چھیڑتے تھے میں مختصر نویس صاحب کو جو میری بغل
میں بیٹھے تھے اشارہ کرتا اور وہ ان حصوں کو لکھ لیتے۔ جب لیاقت صاحب
اس موضوع پر آجاتے جو تقریر میں موجود تھا تو میں مختصر نویس کو اشارہ سے
منع کر دیتا۔ اس طرح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شب میں جب جلسہ برخاست ہوا تو
میں مختصر نویس صاحب کو اسٹاف کار پر اپنے ہمراہ پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ لایا
اور وہاں پریس روم میں انھوں نے تقریر کے نئے حصے پورے خط میں لکھے۔ پھر میں
نے ان پر ایک نظر ڈالی اور انھیں متعلقہ مقامات سے منسلک کیا اور پوری تقریر کی

رات کے کوئی گیارہ بجے صاف نقلیں تیار کرا کے پریس کو بھیجی گئیں۔

جہاں تک یاد آتا ہے جہانگیر پارک کی اس تقریب میں لیاقت علی خاں صاحب نے حکومت کی سال بھر کی کارروائی پر تبصرہ کرنے کے ساتھ دو اور امور پر بھی اظہارِ خیال کیا تھا۔ آج کل اخبارات میں پاکستان کے لیے سہروردی صاحب کی خدمات کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ مجمع میں سے کسی صاحب نے کچھ اس قسم کی آواز اُٹھائی کہ ہندوستان میں کہا جا رہا ہے کہ عہدے اور کرسیاں سنبھالنے والے پاکستان چلے گئے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ اس زمانے کے اخبارات میں اس واقعہ کا تذکرہ ضرور مل جائے گا۔ یہ اشارہ سہروردی صاحب کی طرف تھا اور کرسیاں سنبھالنے والوں سے ظاہر ہے کہ مراد مسلم لیگ کے لیڈروں سے تھی جو پاکستان میں حکومت چلا رہے تھے۔ سہروردی صاحب اس وقت ہندوستان میں گاندھی جی کے چیلے بنے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں معترضین کیا چاہتے تھے؟ کیا پاکستان حاصل کر کے یہاں ہندوؤں سے حکومت کرنے کو کہا جاتا یا اس ملک کو غنڈہ گردی کی نذر کر دیا جاتا؟ ادھر ظاہر ہے کہ سہروردی صاحب اور ہندوستان کے مسلم زعما مسلمانوں کی ہندوستان میں پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے اپنے متذکرہ عمل پر مجبور تھے۔ بہرحال لیاقت علی خاں صاحب نے اپنی آواز کی پوری گرج کے ساتھ انگریزی کی مشہور مثل کے ترجمہ کو دُہرا کر یہ جواب دیا تھا " کتے بھونکتے ہی رہتے ہیں مگر کارواں کا سفر جاری رہتا ہے!" (لیاقت کے مکا دکھانے کا واقعہ اس کے بہت بعد کا ہے۔)

دوسری بات اُنھوں نے مہاجرین کی پاکستان کے ساتھ جذبۂ وفاداری بلکہ مکمل وابستگی کو استقلال بخشنے کے سلسلے میں کہی تھی۔ اول تو اُنھوں نے یہ آوازِ حق اُٹھائی کہ " پاکستان مہاجرین کی جوتیوں کا صدقہ ہے " (یہ عین ان کے الفاظ ہیں)۔ پھر کہا کہ مہاجرین کے دوبارہ ترکِ وطن کا سوال ہی نہیں

---

۵ یہ مضمون "جنگ" کے شہید ملت کے (مصور) ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ تصاویر راقم نے فراہم کی تھیں۔ بلکہ بعد میں اخبار کی درخواست پر ایسی تمام معلوماتی تصاویر کا اپنا ذاتی اسٹاک بھی اخبار کی نذر کر دیا۔

پیدا ہوتا۔ کون بیوقوف اور بدقسمت اپنی مٹی خراب کرنے اب ہندوستان واپس جانے کا خیال بھی دل میں لا سکتا ہے؟ اب تو اُن کا مرنا جینا پاکستان اور صرف پاکستان میں ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ پاکستان کو کچھ لاحق ہوا تو مہاجرین کا ٹھکانہ کھاڑی کے علاوہ کہیں نہیں ہے۔ اس پر ہزاروں کے مجمع نے "پاکستان زندہ باد" "قائدِ ملت زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے تھے۔ اور بار بار لگا رہے تھے۔ میں وہ سماں بھول نہیں سکتا۔

عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے آج یہ واقعہ شاید کسی کو یاد نہ ہو اور نوجوان نسل کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے مگر اس وقت کے اخبارات میرے بیان کی شہادت دیں گے۔ اسی قسم کا فقرہ اپنے زمانے میں ایوب خاں نے بھی استعمال کیا تھا مگر چونکہ وہ فوجی آدمی تھے اور عوام سے اُن کا رابطہ عوامی سطح پر نہ تھا یا جو ہو چلا تھا کٹ گیا تھا عوام پر اُن کے کہنے کا ردِ عمل بالکل صحیح نہ ہوا۔

جہانگیر پارک ہی کے ایک اور جلسے میں لیاقت صاحب نے عوام سے پاکستان کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دینے کا وعدہ کیا۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم کیوں ایسے وعدے کرتے ہو جنہیں پورا نہیں کرسکتے؟ خداوند تعالیٰ کا یہ قول لیاقت علی خاں کو خوب یاد تھا اس لیے انھوں نے سچے دل سے قوم سے جو وعدہ کیا اسے پورا بھی کر دیا۔ اُن کا یہ عمل اُن کے خاصانِ خدا میں سے ایک ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے اور اُن کے شہید ہونے کی مسکت دلیل! اُنھوں نے کہا " اگر پاکستان کی خاطر کبھی خون بہانے کا موقع آیا تو اس خون میں لیاقت علی خاں کا خون سب سے پہلے شامل ہوگا۔" میرا یقین ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کو اپنے ملہمانہ الفاظ سے نوازتا ہے اور اُن کی زبان سے وہ کہلاتا ہے جو اُسے خود کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کیا کسی کو اس امر میں شک ہو سکتا ہے کہ جب مولانا محمد علی نے لندن کی گول میز کانفرنس میں اپنا راج ہنس کا نغمہ الاپا تو اس میں خداوند تعالیٰ کی آواز شامل تھی۔

ع میری آواز بھی شامل تری آواز میں ہے! (جگر)

اسی طرح جس وقت لیاقت علی خاں نے مندرجہ بالا الفاظ کہے وہ خدا کا وعدہ تھا جو اس نے پورا کر کے دکھا دیا۔ چنانچہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ انھیں

شہید ملت کا خطاب پوری طرح زیب دیتا ہے ؎

اسے لیاقت یہ کیا کیا تو نے — خود کو ہم پہ فدا کیا تو نے
خون اپنا کروں گا نذر وطن — آخر اپنا کہا کیا تو نے ![1]

(جلیل قدوائی)

شہید ملت کی شہادت کا واقعہ جو کسی طرح بھولتا ہی نہیں۔ شاید اس زمانے کے کسی آدمی کو نہ بھولا ہو۔ کیسی بھیانک اور تاریک رات تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لوگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے آہستہ آہستہ جیسے کچھ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ شہادت کے واقعہ پر یقین نہ کرنے کی وجہ سے کوئی زور زور سے تذکرہ نہ کرتا تھا۔ ایک بار میرے کانوں میں آواز آئی "اس نازک وقت میں ان کا اُٹھ جانا پاکستان پر قیامت کا ٹوٹنا ہے"۔ کسی اور طرف سے سننے میں آیا "کیا قاتل ہلاک کر دیا گیا؟" پھر سنا "ہائے، پاکستان کے لیے جان دینے کا وعدہ کیسا پورا کر دکھایا"۔ اب معاملہ کی تہ تک پہنچنا کیا مشکل تھا اور اس خبر نے گویا

ع اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے! (غالب)

مگر میرا سینہ کس شمار قطار میں تھا۔ تھوڑی دیر میں جیسے پوری قوم خاک و خون میں لوٹ رہی تھی۔ رات گزارنی پہاڑ کاٹنے سے زیادہ مشکل ہوگئی۔

اس حادثہ کے دوسرے دن کا سماں بھی آنکھوں میں سمایا ہوا ہے بلکہ جب یاد آتا ہے دل کو برمانے لگتا ہے ؎

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — سینہ جویائے زخم کاری ہے!

(غالب)

اس روز کراچی کے سارے راستے نمبر ۱ وکٹوریہ روڈ (اب عبداللہ ہارون روڈ) یعنی شہید ملت کی قیام گاہ کی طرف جاتے تھے۔ پھاٹک کے سامنے بلکہ کوٹھی کے چاروں طرف اور دائیں بائیں دور دور تک حقیقی معنوں میں تل رکھنے کی جگہ نہ

---

[1] حالی سے توارد ہوگیا۔ ان کا مقطع ہے ؎
حالی اُٹھا ہلا کے محفل کو — آخر اپنا کہا کیا تو نے!

تھی۔ اس زمانے میں کراچی میں برسات کے بعد گرمی واپس نہ آتی تھی۔ یعنی یہاں دو گرمیاں نہ ہوتی تھیں، چنانچہ موسم سرما ہو چلا تھا مگر لوگ پسینے میں نہائے جا رہے تھے اور ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ خود کوٹھی کے اندر انسانوں کا ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ کمرے، برآمدے اور لان کی چار دیواری کی حدود تک اپنے محبوب ترین وزیر اعظم کے آخری دیدار کے لیے مشتاقوں کے مجمع سے بھرے ہوئے تھے۔ کوٹھی کی برساتی میں ایک بڑی سفید چادر سے ڈھکی ہوئی شہید ملت کی میت رکھی تھی، چہرہ کھلا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سو رہے ہیں۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ میت کے پاس سے روتے ہوئے گزر رہے تھے۔ پاس ہی بیگم رعنا لیاقت علی خاں تصویر حیرت یا بت بنی ہوئی بیٹھی تھیں۔ سوگوار، سفید براق لباس میں تعزیت کرنے والے بلک بلک کر ان سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے مگر انھیں چپ لگ گئی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ بقول فانی ؎

آنسو تھے سو خشک ہوئے، دل ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

اُن کے ہونٹے پیوندی بیروں کی طرح موٹے اور سوجے ہوئے تھے۔

اندر اور باہر ہجوم کا یہ حال تھا اور مشتاقانِ دید ارکسی قیمت پر اپنے عظیم رہنما کی آخری جھلک سے محروم نہیں رہنا چاہتے تھے یہاں تک کہ کوٹھی میں داخل ہونے والے بغلی راستوں کے ذریعے کسی نہ کسی طرح اندر جانے کے علاوہ عالی شان بند پھاٹک پر چڑھ چڑھ کر سینکڑوں کی تعداد میں اندر پہنچ رہے تھے۔ مضبوط آہنی پھاٹک لوچ کھانے لگا۔ ایک طرف کو گرنے لگا مگر لوگ کسی طرح نہ مانتے تھے تا آں کہ کوٹھی کے اندر سے نواب صدیق علی خاں صاحب نے مائک پر صحن میں کہیں جگہ باقی نہ رہنے کا اعلان کیا! ان کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور مرحوم کا واسطہ دے کر لوگوں کو اندر آنے سے منع کیا۔ شہید ملت کا نام سننا تھا کہ سارے لوگ جو پھاٹک پر اس بری طرح چڑھے ہوتے تھے بے شک اشتیاق دید میں ایکدم جیسے کوئی بجلی کا بٹن دبا دے نیچے اتر آتے۔ پھاٹک سلامت رہ گیا۔ میں سوچتا رہا۔ ع نام میں تیرے یہ تاثیر کہاں سے آئی! (حقی)

اپنی کمزور طبیعت اور منحنی جثہ کے سبب میں وہاں دیر تک نہ ٹھہر سکا اور یہ نظارہ برداشت نہ کر سکا۔ گرنے لگا، شاید بے ہوش ہو کر گر بھی جاتا۔ سدھ

کے علاوہ گرمی اور حبس سے بُرا حال تھا۔ لڑھکتا پڑھکتا دھکے کھاتا کن مشکلات سے نبرد آزما ہوتا کھلی فضا میں پہنچا۔ میں اقبال کرتا ہوں کہ میں اس یگانۂ روزگار شخصیت کے یادگار دفن میں شریک نہ ہو سکا اور وہاں سے تنہا چل دیا۔ میں حوصلہ ہار چکا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے۔

گھر واپس جاتے ہوئے قائد اعظم کے مزار کو (جس کے نواح میں شہید ملت کو دفن ہونا تھا) جانے والی سڑک کی فٹ پاتھ پر مجھے ایک بڑی بی ملیں۔ ساٹھ ستر برس کی عمر تھی، کوئی بھکارن۔ اس دن کے اخبار کے با تصویر صفحات اپنے دونوں پھیلائے ہوئے ہاتھوں میں لیئے آہستہ آہستہ دیکھتی چلی جا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں "بیٹا ذرا ان میں مجھے وہ تصویر تو دکھا دو جس میں لیاقت علی کو لی کھا رہے ہیں۔ میرے آنسو نکل پڑے۔ میں نے کہا "اماں! یہ تو پرانی تصویریں ہیں، وہ حادثہ والی تصویریں تو اب آئیں گی۔"

بڑی بی کو میرے اس جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ اسی جگہ بیٹھ گئیں اور بولیں "خیر، برات تو اسی رستے سے جائے گی! میں اپنے دولہا کی یہیں سے بلائیں لے لوں گی۔"

(۲)

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن[۱]
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی! (اقبالؒ)

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء (مطابق ۱۳ محرم الحرام ۱۳۷۱ھ) کو راولپنڈی کے ایک جلسۂ عام میں قائد ملت جناب لیاقت علی خان کا ایک شقی کے ہاتھوں ناگہاں جام شہادت نوش کرنا ایسا سانحۂ عظیم ہے جس پر نہ صرف مملکت پاکستان میں کہرام بپا ہے بلکہ تمام عالم اسلامی اور امن پسند دنیا رنج و یاس میں مبتلا اور ششدر و حیران ہے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شام کو قائد اعظم نے جو امانت قائد ملت کے سپرد کی تھی اسے محفوظ ترین بلکہ بیش از بیش حالت میں چھوڑ کر مرحوم بالآخر بارگاہ ایزدی میں اپنے

---

[۱] یہ ضروری اقتباس ہے اس تاثر کا جو موصوف کی شہادت کے فوراً بعد قلم بند ہو گیا تھا۔

محبوب مرشد سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

جناب لیاقت علی خاں کی زندگی میں ان کی بے لوث قومی خدمات اور شبانہ روز کی تعمیری سرگرمیوں سے متاثر ہو کر ان کی قوم نے انھیں قائد ملت کا خطاب دیا تھا۔ جن حالات میں ان کی وفات حسرت آیات واقع ہوئی ان کے پیش نظر اگر اہل پاکستان اب انھیں دائمی طور پر شہید ملت کے الفاظ سے یاد کریں تو بالکل بجا ہے کیونکہ ان کی زندگی تا دم آخر اپنی قوم کے لیے وقف رہی اور وہ خلق خدا کی خدمت کرتے ہوئے اس دنیا سے سدھارے۔ یہ دین کی خدمت اور خدا کی اطاعت بھی تھی!

پاکستان میں شہید ملت کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے گوشے گوشے میں ہلچل مچ گئی اور ہر جماعت نے بشمول غیر مسلم جماعتوں اور اقلیتوں کے یک زبان ہو کر اس حادثے کو قوم کے لیے ناقابل تلافی نقصان بتایا۔ خاص کراچی میں دو لاکھ مسلمانوں نے شہید ملت کے جنازے کی نماز ادا کی۔ مختلف مقامات پر غائبانہ نمازیں الگ ہوئیں۔ مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم، ہندو، پارسی، عیسائی، یہودی، مرد، عورتیں اور بچے مرحوم کی قیام گاہ پر پہنچے۔ بے شمار تعزیتی تجاویز منظور ہوئیں اور سات لاکھ کے مجمع نے میت کے جلوس میں حصہ لیا۔ شہر کے مختلف حصوں اور مندرجہ بالا موقعوں پر بکثرت لوگوں کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا گیا۔ یہی صورت مرحوم کی قیام گاہ اور مزار پر قرآن خوانی کے دوران نظر آئی اور ان کا مزار فاتحہ خوانی کے لیے مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

پاکستان سے باہر اسلامی دنیا میں قرآن خوانی اور تعزیتی جلسے کیے گئے اور ہر جگہ سے نہایت مخلصانہ و ہمدردانہ پیغامات آئے۔ دوسرے ممالک اور ان کے حکمرانوں نے بھی اس حادثے پر پاکستان سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا۔ بعض ممالک میں جھنڈے سرنگوں کر دیے گئے اور سرکاری و شہری کاروبار بند ہو گیا۔ دنیا کے بڑے بڑے مدبروں نے انفرادی طور پر پیغامات بھیجے۔ اور اخبارات نے رنج و ملال کا اظہار کیا اور شہید ملت کو خراج عقیدت پیش کیا۔

شہید ملت لیاقت علی خاں اصلی معنوں میں مہاجر تھے پاکستان میں ان کی کوئی جائداد نہ تھی اُن کا ذاتی مکان تک نہ تھا نہ انھوں نے بیگھ بھر زمین الاٹ کرائی۔ انھوں نے اپنا سب کچھ پاکستان پر قربان کر دیا تھا۔ پاکستان کی خدمت کے علاوہ ان کا کوئی "مشغلہ" زندگی نہ تھا۔ شہادت کے بعد اُن کی جیب سے کیا نکلا یا بنک کے حساب میں کتنی رقم پائی گئی سب کو خوب معلوم ہے!!

شہید ملت کو قومی خدمت و ایثار کا بے پناہ جذبہ قائداعظمؒ سے ملا تھا۔ اور سالہا سال تک انھیں کے زیرتربیت رہ کر وہ مسلمانوں کے بہترین لیڈر ہو گئے۔ وہ قائداعظمؒ کے دست راست اور ان کی پالیسی اور مزاج کے بہترین راز داں تھے۔ قیام پاکستان کی مہم میں قائداعظمؒ کے بعد ان کی خدمات سب سے زیادہ تھیں، پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی حیثیت سے انھوں نے مختصری مدت میں پاکستان کو ہر لحاظ سے مضبوط و مستحکم بنانے اور اسے ساری دنیا میں سربلند کرنے کے سلسلے میں جو حیرت انگیز کام کیا اس کی بنا پر تاریخ میں ان کا نام زرّیں حروف میں لکھا جائے گا۔

پاکستان کو روزِ اوّل سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا خصوصاً بابائے ملت کی وفات کے بعد سے جو مصائب در پیش ہوتے انھیں رفع کرنے میں حکومتِ پاکستان کو مرحوم کے تدبر، تیقن، تحمل، استقلال، تجربے اور حوصلے سے بہت بڑی مدد ملی۔ پاکستان کا دفاع، مسئلہ مہاجرین، اقتصادی مسائل، قومی اتحاد و اتفاق، خارجی تعلقات، بعض وہ امور ہیں جن پر ان کی خاص توجہ مبذول رہی اور جن کی ترقی، مضبوطی اور حل ان کے دور کی نمایاں خصوصیات ہیں مگر ان کی عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ وہ ہمیشہ اپنی کامیابیوں کا سہرا پاکستانی عوام کے سر باندھتے تھے۔

پاکستان کے لیے ایک مثالی اسلامی دستور کی ترتیب ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی، انھوں نے مجلس دستور ساز میں "قرارداد مقاصد" پیش کر کے ساری دنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ پاکستان میں کتاب و سنت کی ہدایات کے مطابق اسلامی جمہوریت قائم کرنا چاہتے

تھے جس کی شرطِ اولیں اقلیتوں، کمزوروں اور غریب لوگوں کے ساتھ منصفانہ بلکہ فیاضانہ برتاؤ ہے۔ ان کا ایمان تھا کہ اسلامی جمہوریت ہی دنیا کے موجودہ مصائب اور ناانصافیوں کا علاج ہے، وہ پاکستان کو "اسلامی جمہوریت کی تجربہ گاہ" بنانا چاہتے تھے اور انھیں یقین تھا کہ اس تجربے کے کامیاب عملی نتائج کو دیکھ کر ساری دنیا اسلامی اصولوں کی قائل ہو جائے گی۔ اپنے امریکہ کے سفر میں انھوں نے ان خیالات کی خاص طور پر ترویج کی تھی۔

وہ تمام کمزور ملکوں اور قوموں کے عموماً اور عرب و اسلامی ممالک کی آزادی کے خصوصاً زبردست حامی تھے اور یہ اثر پاکستان کی خارجی حکمتِ عملی میں نمایاں تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اسلامی دنیا میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور وہاں کے لوگ انھیں اپنا رہبر سمجھتے تھے۔

وہ بڑے جری، بے باک اور حق گو رہنما تھے اور جو بات پاکستان کے حق میں بہتر سمجھتے تھے اسے برملا کہتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ انھوں نے پاکستان کو دولت مشترکہ میں شامل رکھا اور اپنی قابلیت کی وجہ سے دولتِ مشترکہ کے لیڈروں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہو گئے۔ مگر انھوں نے یقین دلا دیا تھا کہ اس ادارے میں پاکستان کی شمولیت کسی کمزوری پر مبنی نہیں بلکہ پاکستان کے مفاد میں ہے اور جس دن انھیں دولت مشترکہ سے ناانصافی کا یقین ہوا اسی دن بلکہ اسی منٹ پاکستان کو اس سے علیحدہ کر لیں گے۔

ان کی ہدایت میں حکومت پاکستان نے کشمیر کے مسلمانوں کو منصفانہ اور آزادانہ استصوابِ رائے کا حق دلانے کی مسلسل جد و جہد کی اور پاکستان و ہند کے اس تنازعہ کے حل کرنے میں سلامتی کونسل کے ہر اقدام کا ساتھ دیا۔ نیز پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پُر امن تعلقات برقرار رکھنے کی غرض سے اپنی طرف سے نہایت پُر خلوص لیاقت نہرو معاہدہ بھی کیا تھا۔

بلاشبہ پاکستان کو شہید ملت جیسی دور اندیش، بردبار اور بین الاقوامی وقار رکھنے والی شخصیت کی شدید ضرورت تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر، خدا کی مصلحت کچھ اور تھی!

شہید ملت ہم پہ فدا ہو گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بارہا کہا تھا کہ وہ پاکستان کے تحفظ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ کراچی میں عید الفطر کے موقع پر ایک جلسۂ عام میں اُن کی تقریر کے یہ الفاظ ہر شخص کو یاد ہیں۔ " بھائیو اور بہنو! میرے پاس کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو میں پاکستان کی نذر کروں۔ ... ایک میری جان ہے وہ پاکستان کے لیے ہر وقت حاضر ہے "۔ انھوں نے اپنی جان پاکستان کی نذر کر دی ؎

کبھی تھی جاں نثاری کی جو حسرت
وہ پارے کر کے بھی ہم نے دکھا دی!

مگر ان کی کشت اُمید کا حاصل، ان کی جد و جہد کا نتیجہ، پاکستان زندہ ہے اور زندہ رہے گا، انشاء اللہ۔

نواب مزمّل اللہ خاں

۱۹۰۶ء کے مشہور شملہ ڈیلی گیشن کے جو لارڈ منٹو والیسرائے ہند سے مسلمانوں کے سیاسی مطالبات پیش کرنے کے سلسلے میں ملا تھا اور جنھیں ۱۹۰۹ء میں لارڈ مارلے وزیر ہند نے منظور کرلیا تھا، آپ بھی ایک رکن تھے۔ فہرست اراکین میں آپ کا نام محمد مزمل اللہ خاں زمیندار درج تھا اگرچہ اس وقت آپ خان بہادر، سکریٹری، زمیندار الیسوسی الیشن یوپی اور جوائنٹ سکریٹری ایم اے او کالج ٹرسٹینر علی گڑھ بھی تھے۔ اپنی عمر کے آخر یا کم ازکم علی گڑھ میں میرے دورانِ قیام (۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۰ء) تک آپ نواب بہادر ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں کے سی ایس آئی، کے سی آئی ای، ایل ایل ڈی، آف بھیکم پور ہو چکے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ آپ جملہ دینوی امور اور ملکی، مالی نیز قومی مسائل میں انتہائی زیرک واقع ہوئے تھے۔ نیز جز رسی؛ اور کفایت شعاری کے ساتھ زندگی گزار کر اپنی دولت خلق خدا اور قوم کی خدمت پر شاہانہ انداز میں صرف کرتے تھے۔

مجھے کئی بار آں کی کوٹھی واقع بھیکم پور میں بہ کارِ سرکار قیام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہیں، نہ صرف موصوف کی اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی سے مستفید ہوا بلکہ اپنی آنکھوں سے انھیں اپنی جائداد کے ذرا ذرا سے معاملات پر اپنے منشیوں اور اہل کاروں سے جرح کرتے حتیٰ کہ مویشی خانے میں بہ نفس نفیس تشریف لے کر جانوروں کے بچے کھچے چارے اور اس کے متعلقات مثل بھوسہ، کربی، کھلی، گوبر، کنڈوں وغیرہ تک کا حساب کتاب لیتے ہوئے بھی دیکھا اور اس سے بھی زیادہ ذہانت اور وقت وہ حکومت وقت کو قابو میں رکھنے اور مقامی مسائل کو حسب دل خواہ ہموار کرنے میں صرف کرتے تھے۔ عالم گیر جنگ میں انگریزوں کی نفری اور روپے سے مدد کرنا یا سرکاری امدادی فنڈوں میں چندہ دینا تو معمولی بات تھی۔

نواب صاحب کی ہر کام کی تفصیل میں جانے کی عادت کا اندازہ میرے ایک ذاتی معاملے سے بھی ہو سکتا ہے۔ جب ۱۹۲۶ء میں سجاد حیدر

صاحب نے جو اس وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، مجھے اپنے دفتر میں ملازم رکھنے کے کاغذات نواب صاحب کی خدمت میں بھیجے تو ان پر موصوف نے لکھا" تقرر سے پہلے میں امیدوار کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔ دوسرے دن سجاد صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے دیکھ کر مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ خوشنودی کا اظہار کیا اور تقرری پر دستخط کر دیے۔ اسی طرح مستقلی کے وقت بھی طلبی ہوئی اور حسب سابق نواب صاحب نے اپنی خوشنودیٔ مزاج کا اظہار کیا بلکہ زبانی فرمایا۔" ہم تمھارے کام سے بہت خوش ہیں"۔ یہ جملہ نواب صاحب نے میرے کام کی بابت سجاد صاحب کی رپورٹ ملاحظہ فرمانے کے بعد کہا تھا۔ اور ظاہر ہے میری ہمت افزائی کے لیے کہا گیا تھا۔

وہ سر سید اور اپنے چچا عنایت اللہ خان (رئیس بھیکم پور) کی آنکھیں دیکھے اور دونوں کے ساتھ کام کیے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کئی بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے منصرم اور مستقل وائس چانسلر رہے اور یونیورسٹی کو لاکھوں روپے دیے۔ ایک بار یکمشت دو لاکھ روپے عطا فرمائے جو آج کل کے حساب سے کم و بیش پچاس لاکھ روپے ہوتا ہے۔ بعض لوگ اُنھیں حریص کے بجائے کنجوس سمجھتے تھے مگر ایسے دریا دل کنجوس ہمارے ہاں دس بیس بھی ہو جائیں تو ہمارا بیڑا پار ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ہمارے آزاد ملک پاکستان میں جہاں قرض کو آمدنی سمجھ کر فضول خرچی کرنا ہماری قومی صفت سمجھی جاتی ہے اس کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ کاش ہماری حکومت امریکی مہاجنوں کے قرض کے دھبے (وہ ایڈ کہتے ہیں) ذلیل چکر سے باہر نکلے۔

علی گڑھ میں نواب صاحب کی عالی شان کوٹھی کا نام "مزمل پیلیس" تھا۔ یہ یونیورسٹی سے دودھ پور گاؤں کی طرف جانے والی سڑک کے شروع میں بائیں جانب واقع تھا۔ کسی زمانے میں یہ افیم کی کوٹھی کہلاتی تھی۔ یعنی انگریزی حکومت کے محکمۂ افیم کے افسروں کا دفتر اور گودام۔ اس میں ایڈی سیکرٹری شپ کے دوران نواب محسن الملک کا قیام بھی رہ چکا تھا مگر نواب مزمل اللہ خاں صاحب کے قبضے میں آنے کے بعد اس کے آس پاس کی اراضی کے حصول اور عمارت کی تعمیر و توسیع نے اس کا حلیہ ہی بدل دیا تھا۔

عام طور پر یہاں سناٹا رہتا تھا مگر نواب صاحب کے بھیکم پور سے عارضی

طور پر آکر علی گڑھ میں قیام کے زمانے میں اس وسیع و عریض خوبصورت عمارت کی رونق دیدنی ہوتی۔ روشنیوں، صفائی اور آرائش سے زیادہ نواب صاحب سے سرکاری اور غیر سرکاری ملاقاتیوں، قومی رہبروں اور کارکنوں، یونیورسٹی کے اعلیٰ افراد اور علما و فضلا کے جم غفیر کی گہما گہمی سے سارا علاقہ بھرا ہوتا۔

لوگوں کی ایک ٹولی کوٹھی کے صدر دروازے پر ٹہلتی ہوتی اور بہت سے دوسرے اصحاب کی مسلسل آمد سے اس میں اضافہ ہوتا جاتا۔ ایک اور ٹولی اندر کے بڑے بڑے سرسبز لانوں پر بیٹھی، ٹہلتی یا لوٹتی رہتی۔ ملاقاتیوں کا تیسرا گروہ کوٹھی کے برآمدے میں پڑی ہوئی لاتعداد کرسیوں اور چوکیوں پر بیٹھا اندر جانے کے لیے منتظر ہوتا۔ حاضری کے لیے پہلے سے ملاقات کا وقت مقرر کرنے یا کام کی نوعیت بتانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ملاقاتیوں کا جو تھا گروہ کوٹھی کے اندر عام ملاقات کے کمرے میں نواب صاحب سے مصروف گفتگو ہوتا یا اُن کے الطاف کریمانہ و شیریں گفتاری سے محظوظ ہوتا۔ ایسے قیام علی گڑھ کے موقع پر ایک خاص دن نواب صاحب غربا و اہلِ غرض کی پُر خلوص، اور بے لوث حاجت روائی کرتے۔

ایک بار نواب صاحب کو شدید نزلے کی شکایت تھی۔ حاضرین میں سے ہر شخص موصوف کا مزاج دریافت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نواب صاحب دوائیں اور عرق پیتے جاتے اور بڑی نقاہت کے ساتھ اپنا حال بیان کرتے جاتے۔ اتنے میں کسی نے سر ولیم میرس گورنر یوپی کی طرف سے آیندہ کسی تاریخ پر لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ڈنر کا ذکر چھیڑ دیا۔ جھٹ فرمایا۔ "جی ہاں دعوت نامہ میرے پاس آگیا ہے مگر ذرا غور کیجیے میں اس حالت میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں۔ بیماری میں سفر کرنا ویسے ہی خطرے سے خالی نہیں پھر میری مصروفیات آخر یہاں کے کام کیسے پورے ہوں گے۔ وہ دیکھیے ڈسٹرکٹ بورڈ کے سیکرٹری صاحب بیٹھے ہیں۔ یہ میونسپل کمیٹی کے فائل میرے داہنے ہاتھ پر رکھے ہیں۔ سامنے رجسٹرار سید سجاد حیدر صاحب اپنے کاغذات لیے تشریف رکھتے ہیں بھلی بار اُن کے کاغذات کے ملاحظے کی فرصت نہ ملی تھی بھئی کہاں گئے عمران خاں (نواب صاحب کے سیکرٹری) کوئی بلاؤ انھیں۔ گورنر صاحب کو لکھ دیں کہ میں شریک نہیں

ہو سکتا۔ "عمران خاں آئے، ان سے پوچھا "دعوت نامہ کہاں ہے؟" پڑھ کر سنایا گیا اور دستخطوں کے لیے جواب کا مسودہ فوراً پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ مجمع چلا گیا۔ میں اور سجاد صاحب حکماً روکے گئے کہ کاغذات حاضرین کے چلے جانے کے بعد ملاحظہ کیے جائیں گے۔ دوسرا مجمع آیا اور وہی ڈراما دہرایا گیا۔ عمران خاں پھر بلائے گئے۔ "کہاں چلے گئے تھے؟ کارڈ لاؤ اور جواب میں فوراً انکار لکھو"۔ تیسرے اور چوتھے مجمع کے سامنے بھی یہی حال رہا۔

نواب صاحب یوپی حکومت کے ہوم ممبر ہو گئے تھے۔ اپنی مخصوص انگریزی میں اپنے خیال میں اپنے بیان میں کوئی لطف پیدا کرنا چاہتے تھے فرمانے لگے:-

"I AM HOME MEMBER OF U-P GOVERNMEMT AND I AM A MEMBER OF MY HOME."

معلوم نہیں مطلب کیا تھا۔ ان کی مخصوص انگریزی کی دور دور شہرت تھی۔ بہ حیثیت وائس چانسلر یونیورسٹی پر اپنے اخراجات کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے اور رجسٹرار کے مختصر نویس لطیف صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ کہتے تھے:

"POOR MUZZAMMIL HAS NO CENOMOTO GRAPHER OF HIS OWN"

مجھے ان کی انگریزی کی تعلیم اور قابلیت کے بارے میں علم نہیں مگر وہ انگریزی کا مفہوم بہ خوبی سمجھ لیتے تھے اور جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے بہ وقت ضرورت اپنی مخصوص انگریزی میں اپنا مفہوم خوب ادا کر لیتے تھے۔ ایک بار یونیورسٹی کی ایک عرض داشت کے خاتمے پر مستعمل رسمی فقرہ YOUR MOST OBEDIENT SERVANT کے بعد AND LOYAL کے الفاظ اپنے ہاتھ سے بڑھا دیے، تب دستخط کیے۔ ہم کہتے رہ گئے کہ نواب صاحب یہ طریقہ نہیں ہے۔ ڈانٹ کر بولے "آپ کیا جانیں، ہیرس (مسٹر ولیم ہیرس گورنر) علی گڑھ میں اپنی مجسٹریٹی کے زمانے سے مجھے اور میری انگریزی کو خوب جانتا ہے۔" کبھی کہتے لوگ میرے خلاف ایجنڈا کرتے ہیں یعنی پروپیگنڈہ۔

انھیں اپنی مسلسل اور شاندار قومی خدمات اور تعلیمی سرپرستی نیز بڑے بڑے انگریز عہدہ داروں اور نامور تاریخی شخصیتوں کے ساتھ اپنے

روابط پر بڑا ناز تھا۔ اپنے زمانے کے کسی شخص یا یونیورسٹی کے کسی افسر یا استاد کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بھرے جلسوں میں سختی کے ساتھ ڈانٹ دیتے "تم تعلیم کو کیا جانو"! شہر علی گڑھ اور صوبے کے کم و بیش ہر سرکاری، نیم سرکاری، سوشیل اور نیم سیاسی تحریک اور ادارے سے وابستہ تھے۔ حکام میں بڑے دخیل تھے اور اُن کے خدمت میں یادداشتیں مرتب کرنے میں اپنی منفرد انگریزی لکھنے پر اصرار کرتے تھے۔

بہ حیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی جب نواب صاحب بھیکم پور سے علی گڑھ تشریف لاتے تو کم از کم پہلے دن تو یونیورسٹی کا کم و بیش سارا کام بند ہو جاتا، اس لیے کہ وہ متوقع ہوتے کہ ہر قابلِ ذکر شعبے کا افسر اور عہدہ داران کی خدمت میں حاضر ہو کر متعلقہ معاملات کی روداد پیش کرے۔ اس ہدایت کے پیشِ نظر بیشتر طلبہ اور اوسط درجے کے اہل کار بھی نواب صاحب کے سلام کو جانا اور اپنے مسائل ان کے سامنے پیش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ نواب صاحب طلبہ اور معمولی عہدے داروں سے بڑی محبت سے ملتے اور ان کی دل جوئی کرتے۔

نواب صاحب فارسی کے شاعر بھی تھے۔ غالباً یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ جوبلی ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے کہ سر ولیم میرس کی آمد کے سلسلے میں ایک بڑی دھوم دھام کا جلسہ منٹو سرکل کے آس پاس کے ایک میدان کو شامیانوں اور قناتوں سے آراستہ کر کے منعقد ہوا۔ نواب صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر کے بعد مہمانِ خصوصی کی شان میں رودکی کے مشہور قصیدہ

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی

کی طرح میں اپنے اشعار سنائے جن پر سر ولیم بہت محظوظ ہوئے۔ نواب صاحب نے اپنی تقریر میں سر ولیم میرس سے اپنے خصوصی تعلقات کی تفصیلات بھی مزے لے لے کر بتائی تھیں۔ غالباً جس دو لاکھ روپے کے عطیے کا میں نے آغازِ مضمون میں ذکر کیا ہے، اس کا اعلان اسی موقع پر کیا تھا۔

نواب صاحب کو ایک صدمہ پڑا تھا۔ ان کے بیٹے امان اللہ خاں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی وقت یو پی کے نئے گورنر سر الگزنڈر ہاڈی مین کی حد سے زیادہ شراب پی لینے کے سبب اچانک موت واقع ہو گئی۔ ڈایار کی

(دوعملی حکومت) کا دور تھا۔ نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری بہ القابہ عارضی گورنر مقرر ہوئے۔ اُن کے نام کی ابتدا ہز اکسلنسی سے ہونے لگی۔ ہم لوگ نواب صاحب کی کم عمر، بڑھاپے کی اولاد کی وفات پر تعزیت کے لیے گئے تھے مگر ہم نے اُن کو سارے وقت چھتاری صاحب کی گورنری کی خبر پر افسردہ پایا۔ وہ ہر ایک سے کہتے تھے "آپ نے سُنا؟ چھتاری گورنر ہو گئے"۔ تقسیم لوہ نواح علی گڑھ کی سب سے بڑی موروثی ریاست تھی جس کے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے اور انھوں نے انگریزوں کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ صوبے کی حکومت کا سب سے بڑا عہدہ ان کے سوا کسی اور کو مل سکتا تھا۔

اُردو کی اپنے وقت کی مشہور شاعرہ اور مصنفہ زمخ بش (زاہدہ خاتون شروانی) جس کی نظم "لذتِ عرفاں" نے شعری اور علمی حلقوں میں دھوم مچادی تھی اور جس پر اہلِ دل آج بھی سر دُھنتے ہیں نواب صاحب اس کے والد بزرگوار تھے۔ موصوف اس کے لیے ایسے رشتے کے متلاشی تھے جو اُن کی جائیداد یا اس کے کسی حصّے کو خاندان سے باہر لے جانے کا موجب نہ ہو۔ اِدھر یہ انتظامات ہو رہے تھے اُدھر اس حرماں نصیب کا خدا کے گھر سے بلاوا آگیا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فانی کا یہ شعر اس جواں مرگ ناکتخدا شاعرہ کے حال پر صادق آتا ہے ؎

آپ سوچا ہی کیے اس سے ملوں یا نہ ملوں
موت مشتاق کو مٹی بیں ملا بھی آئی!

مولانا ظفر علی خاں

ابھی ابھی ٹی وی پر مولانا ظفر علی خاں کی یاد میں لاہور سے ایک مذاکرہ پیش کیا گیا جسے وقت کی ناگزیر کمی کے باوجود لبا غنیمت کہا جا سکتا ہے اگرچہ مقرر صاحب نے جو جامعہ پنجاب کے ایک جانے بوجھے اور باخبر استاد رہ چکے ہیں یہ غلط کہا کہ مولانا حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ میں ملازم تھے۔ وہ حکومت کے ہوم ڈپارٹمنٹ میں مترجم تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔ دارالترجمہ تو عثمانیہ یونیورسٹی سے متعلق تھا جو ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی اور دارالترجمہ اس سے دو سال پہلے یعنی ۱۹۱۶ء میں وجود میں آیا تھا جب مولانا کو حیدر آباد چھوڑے بارہ برس گزر چکے تھے۔

میں اس پروگرام میں شریک ہوتا تو چند باتیں اور بھی عرض کرتا جو شرکائے مذاکرہ کے ذہن میں نہیں آئیں یا وقت کے ناگزیر اختصار کی نذر ہو گئیں (کاش کہ ہمارے ہاں ایسے اداروں کے منتظمین میں سے کسی ایک کے دل میں کبھی یہ بات گھر کر سکے کہ اُن بزرگوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے جنھوں نے ہمیں منتشر افراد سے ایک قوم بنانے اور اسے آزاد کرانے میں صبح و شام ایک کر دیے اور جو اس فرض کی خاطر اپنی ساری زندگی کے آرام کو ختم کر کے خوشی خوشی مرض الموت کے منہ میں چلے گئے کچھ تو سیر حاصل وقت دیا جائے) تین چیزیں مولانا کی شاعری کے بارے میں خاص طور پر قابل ذکر تھیں۔ اول یہ کہ وہ داغ کے شاگرد تھے۔ دوئم جس طرح محسن کاکوروی کی نعت ؎

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

نے اردو شاعری کی اس صنف میں ایک منفرد اور غیر فانی جگہ حاصل کر لی ہے اسی طرح مولانا کی یہ دو نعتیں اردو میں ایک امتیازی اور یادگار حیثیت کی حامل ہیں، اگرچہ محسن کی نعت طویل اور قصیدہ کی شکل میں ہے اور مولانا کی نعتیں نسبتاً مختصر اور غزل کے رنگ میں ہیں۔

ے وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس[۴] برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنّا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

تیسری بات یہ قابلِ ذکر تھی کہ مولانا ظفر علی خاں، اکبر الٰہ آبادی کی طرح قافیہ کے بادشاہ تھے، بالخصوص اپنی سیاسی، طنزیہ شاعری میں تو انھوں نے اپنے اس وصف کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ نیز اس قسم کے اشعار کہنے میں انھیں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ یعنی ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی، اگرچہ قافیے بہت محدود ہوتے تھے جس کی بنا پر "قافیہ تنگ" ہونے کا محاورہ ایجاد ہوا، بلکہ محدود اور مشکل قافیوں میں اُن کا جی زیادہ لگتا تھا۔ اور وہ ان پتھروں کو پانی کر دیتے تھے[۱]۔ اُن کا یہ مطلع اس سلسلے میں مشہور ہے ے

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں، اک ساورکر اک گاندھی ہے[۲]
اک جھوٹ کا چلتا چکر ہے، اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے[۳]

---

[۱] سوداؔ: بلایا کوہ پر شیریں کو اسے فرہاد کیا کہنا
بڑے پتھر کو پانی کر دیا استادؔ کیا کہنا!

[۲] ہندوستان میں تقسیم سے قبل کی رسوائے زمانہ مسلم دشمن جماعت ہندو مہاسبھا کا لیڈر، گاندھی سے جنھوں نے اپنے کو ہمیشہ مسلم دوست ظاہر کیا، کہیں زیادہ سفاک اور بے باک!

[۳] اکبر الٰہ آبادی نے اس مطلع کے قافیے اپنے ایک مطلع میں یوں نظم کئے ہیں ے

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

واضح ہو کہ بدھو میاں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی عرفیت تھی جو کانگریس کے ساتھ تھے اور جنھوں نے علی برادران کو مولانا کا خطاب عطا کیا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے جس کے وہ ایک فعال رکن تھے، موسم گرما کے اجلاس میں جب حکومت ہند کا قیام چھ سات ماہ شملہ میں رہتا تھا مولانا مسلم ہوٹل میں قیام فرماتے تھے۔ وہیں پر چند اور نامور ارکان یعنی مولانا شوکت علی، نواب صدیق علی خاں اور موخرالذکر کے ناگزیر ساتھی اور یارِ غار حاجی عبدالستار سیٹھ بھی مقیم ہوتے تھے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

نواب صاحب کا دستر خوان ہوٹل کی فراخ شہ نشین میں اسمبلی کی یومیہ نشست کے بعد شام کی چائے اور رات کے کھانے کے لیے موصوف کے دوستوں اور محبوب ادبا و شعرا کے لیے وقفِ عام ہوتا تھا۔ میں نے بارہا دیکھا (حیرت شعلوی[1]، اسد ملتانی اور راقم سطور کم از کم چائے کی نشست پر ضرور موجود ہوتے تھے۔ کلام سنانے کی شرط نہ تھی مگر ہم خود اپنا اپنا کلام سناتے تھے) کہ ہم سب کے ہجوم میں ایک طرف ایک نیلی پوش مولانا ظفر علی خاں کے لیے حقہ تازہ اور تیار کر کے لایا اور مولانا نے کش لینے شروع کیے اور دوسری طرف نزولِ شعر کا آغاز ہوا اور انھوں نے اسی وقت زمیندار کے اگلے ایڈیشن کے لیے پورے ٹائیٹل پر جلی قلم سے شائع ہونے والی مشکل سے مشکل قافیوں کی اور کسی تازہ سیاسی واقعہ پر ایک بے نظیر نظم املا کرا دی۔ واضح ہو کہ روزنامہ زمیندار جہازی سائز میں شائع ہوتا تھا بلکہ شاید اردو اخبارات

---

[1] مرحوم۔ ان پر میرا مضمون میرے مجموعہ "چند اکابر، چند معاصر" میں ملاحظہ ہو۔ ایک شعر ان کی یادگار کے طور پر ہر وقت زبان پر رہتا ہے ؎

کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پر نثارِ ہستیِ پروانہ ہو گئی

[2] مرحوم۔ تعارف سے مستغنی ہیں قومی اور اخلاقی شاعری کے بادشاہ تھے۔ یہ شعر ان کا مشہور ہے۔ ایسی حقیقت اس لطف اور صفائی کے ساتھ کم شعرا نظم کر سکے ہیں ؎

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

کے اس سائز میں شائع ہونے کے روایت زمیندار ہی نے قائم کی تھی۔
ایک اور بات میں ٹی وی پروگرام میں یہ کہتا کہ تحریر و تقریر دونوں میں مولانا ظفر علی خاں استناد کا درجہ رکھتے تھے۔ کیا مجال گمان بھی ہو سکے کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا تھا کہ پنجابی انھیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ نہ لہجہ، نہ تلفظ، نہ زبان، نہ طرزِ بیاں، کسی چیز سے بھی تو وہ غیر اہلِ زبان نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اس وصفِ خاص میں شیخ عبدالقادر بھی اُن کے شریک تھے۔

اُن کے اخبار کے بارے میں دو اور باتیں کہنے سے رہی جاتی ہیں اور یہ بھی میں ٹی وی کے مذاکرے میں کہتا۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) میں زمیندار ہی اُردو کا وہ اخبار تھا جو مشہور (اگرچہ مسلمانوں میں بدنام زمانہ) انگریزی خبر رساں ایجنسی رائٹرز سے براہ راست خبریں حاصل کرتا تھا۔ انگریزی اخبارات سے خبروں کے خلاصے یا ترجمے نہیں شائع کرتا تھا۔ اس وقت وہ گلابی رنگ کے کاغذ پر چھپتا تھا۔ میں بلگرام میں تھا اور ممکن ہے شاید ڈاک ایڈیشن اُسی رنگ پر چھپتا ہو)۔ نیز اس زمانے کے ہزار ہا روپیوں کی ضمانتیں ملک کی آزادی کی خاطر جتنی زمیندار نے ضبط کرائیں کسی اور اخبار نے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ آج تک کسی انگریزی اخبار نے بھی ضبط نہیں کرائیں۔

تقسیم کے چند سال بعد اُن کا آخری دیدار نصیب ہوا۔ میں اور ڈاکٹر ریاض الحسن[1] مری میں مقیم تھے۔ مولانا بھی وہیں تھے۔ ہم اُن سے ملنے گئے۔

---

[1] اُردو اور انگریزی کے گھاگھ اہلِ قلم اور صحافی، معاملات اور معلومات کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا، اردو، انگریزی، فرانسیسی، روسی، اور ترکی زبانوں کے ماہر اور عالم، مصنف، مؤلف، مترجم مولانا محمد علی کے دوستوں میں تھے۔ تقسیم سے قبل کلکتہ میں اور وفات سے پہلے کراچی میں انگریزی اخبار "مارننگ نیوز" سے متعلق رہے۔ پاکستان کے شعبۂ اطلاعات میں میرے رفیق کار تھے۔ پھر فارن سروس کے پہلے انتخاب میں شامل ہو کر ترکی، روس اور سری لنکا میں پاکستان کے سفیر رہے۔ ایسے جامع لوگ اب کہاں!

چہرہ سوج گیا تھا۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ بستر پر دراز تھے۔ ہمیں چائے پلانے کا انتظام کیا تھا مگر ہمارے شدید اصرار کے باوجود کہ انھیں تکلیف نہ دی جائے دو ہمراہیوں کے سہارے کھانے کی میز تک لاکر ایک کرسی پر بٹھا دیئے گئے۔ باتیں ہم ہی کرتے رہے۔ وہ صرف نقش دیوار تھے۔ زبان ہلاتے تھے مگر اُن کی بات ہمارے سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جو کبھی اپنی تقریروں سے ہزاروں کے مجمع میں آگ لگا دیا کرتا تھا ؎

نالوں سے میں نے آگ لگادی جہان میں

صیاد جلا نہ تھا فقط مشتِ پَر مجھے! (داصغر)

مگر اب وہ بہ شکلِ منقارِ زیرِ پر رہ گئے تھے۔ اس کے کچھ دن بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون!

عرصہ ہوا ڈاکٹر ریاض الحسن کا بھی انتقال ہوگیا اور اب تو راقم کے بارے میں بھی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ میرے عزیز دوست محمود اکبر آبادی کے الفاظ میں "بدن کا تھکا ماندہ مسافر خدا جانے کس روز روح کا بوجھ سر سے اُتار پھینکے"۔ یہ انھوں نے اپنی اٹھتر[۸] برس کی عمر میں لکھا تھا، میں تو نواسی، بلکہ قمری حساب سے جس میں انگریزی کے مقابلے میں ہر تینیس سال کے بعد ایک سال کا اضافہ ہو جاتا ہے، بانوے سال کا ہو چکا۔

لوگ بیماروں کی عیادت کو جاتے ہیں جیسے میں اور ریاض مولانا کی عیادت کو گئے تھے اور بیمار مر جاتے ہیں پھر عیادت کو جانے والوں کا وقت آجاتا ہے۔ بقائے دوام اسی ایک ذات کو ہے

---

[۸] ان پر میرا مضمون اسی مجموعہ میں کہیں دیکھیے۔

ستارے جن کے نشیمن سے زیادہ قریب

رضا علی وحشت

خان بہادر رضا علی وحشت، تعارف سے بے نیاز ہیں۔ اساتذۂ وقت میں سے تھے۔ جس طرح حضرت شاد عظیم آبادی نے بہار میں اردو غزل کی حیات بخش روشنی پھیلائی جناب وحشت کلکتوی نے بنگال میں عموماً اور نواح کلکتہ میں جو بذاتِ خود ایک چھوٹا سا بنگال تھا خصوصاً اُردو زبان کو مقبول عام بنانے میں ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ اور اپنے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ قائم کر کے دُور دُور اُردو کو سکۂ رائج الوقت بنا دیا۔

راقم بچپن ہی سے جناب موصوف کا قائل ہو گیا تھا اگرچہ بدقسمتی سے اُن کی زیارت نصیب نہ ہو سکی۔ غائبانہ تعارف اپنی ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں اُن کی نظم "میرے" کے ذریعہ ہوا جو شیخ عبدالقادر کے مشہور زمانہ رسالہ "مخزن" میں شائع شدہ پڑھی تھی اور جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے

ع خوشا وہ دل کہ جس میں قلزمِ غم کی ہے طغیانی

آپ نے شہرت بہ حیثیت متبعِ غالب پائی جس میں فانی کے علاوہ کم غزل گو آپ کے حریف گزرے ہیں۔ سچ پوچھیے تو کلام میں مضامین کی وسعت اور تنوع نیز اپنے دور کی اک موجِ تہ نشیں کی مصوری کے اعتبار سے غالب کا اب تک کوئی ہم سر پیدا نہیں ہوا۔ ویسے تو اس کے بعد سے آج تک اندازِ بیان کے لحاظ سے غالب ہی کا دور ہے۔ صاحبِ دیوان تھے بلکہ کئی مجموعے شائع ہوئے۔ تقسیم کے بعد کلکتہ سے ڈھاکا چلے گئے تھے اور وہیں انتقال فرمایا۔

موصوف کا یہ ایک خط جس زمانے میں راقم سطور بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر مطبوعات رسالہ "ماہ نو" کا نگراں تھا از خود میرے پاس آگیا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خردوں کی حوصلہ افزائی بھی جناب کا شیوۂ خاص تھا۔ میری ایک غزل "ماہ نو" میں شائع ہوئی تھی جس کا مطلع تھا ؎

آغازِ عاشقی کے زمانے کو بھول جا
اے دل اب اس حسین فسانے کو بھول جا

تو ازراہ ذرہ نوازی موصوف اس غزل کے مقطع کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس خط کا متن ایک بیش قیمت یادگار کے طور پر محفوظ کر دینے کو جی چاہا۔ یہاں درج کرتا ہوں :۔

" ڈھاکا
۲۰ ر اکتوبر ۵۰ء

محترمی۔ تسلیم

جناب کے ایک شعر سے میں بہت متاثر ہوا ؂
دنیائے عشق کی جو یہی رسم ہے جلیلؔ
تو بھی لٹا کے دل سے خزانے کو بھول جا
ساتھ ہی غالبؔ کا شعر یاد آیا۔ وہ گھر بار لٹا کے پچھتایا تھا۔ دل کا خزانہ لٹانے کے بعد گھر بار کی نوبت آسکتی ہے !
؂ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
نیاز کیش، وحشتؔ

راقم نے آں محترم کو شکریہ کا خط لکھ دیا تھا۔

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

کون ہے جو آپ کی معرکہ آرا کتاب "ہماری شاعری" سے واقف نہیں جسے موصوف حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کا تتمہ کہتے تھے اور جو ہر شایق نقد کے لیے ہر دم ایک تازہ تحفہ ہے۔ آپ کے نام کے ساتھ ادیب لکھا جاتا ہے۔ اگر یہ تخلص ہے تو راقم نے آپ کا کوئی شعر نہیں سنا یا پڑھا۔ اُردو کے ایم اے کے امتحان زبانی (۱۹۳۳ء) میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں سید صاحب میرے ممتحن تھے اور لکھنؤ سے آئے تھے۔

آپ نے انیس پر نہایت قابلِ قدر کام کیا ہے اور "روحِ انیس" آپ کی بے مثل یادگار ہے جس میں میر صاحب کے منتخب مراثی کے علاوہ ان کے بہترین سلام بھی شامل ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ سلام پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی اُردو شاعری کی کتنی بیش قیمت اور خوبصورت صنف ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس صنف کی خوبصورتی، معنویت، پختگی بھی میر صاحب ہی پر ختم ہے اور اُن کا یہ شعر انھیں پر پورا پورا صادق آتا ہے ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا!

ادیب صاحب نے اس کتاب کا مقدمہ بھی نہایت فاضلانہ لکھا ہے۔

میں نے موصوف سے ایک مشہور غزل کے بارے میں جو میر سے منسوب ہے اور جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں دریافت کیا تھا کس کی ہے کیوں کہ استادِ سخن میر کے ہاں نہیں ملتی ؎

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا، میرے بعد[1]

---

[1] بر سبیل تذکرہ یہ امر ناظرین کی دل چسپی کا موجب ہو گا کہ پاکستان ٹی وی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

منہ پہ رکھ دامنِ گُل روئیں گے مرغانِ چمن
ہر روش خاک اُڑائے گی صبا میرے بعد

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

اس غزل کے کئی اشعار بجنسہٖ یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دند لکھنوی نیز اور شاعروں کے کلام میں گھُل مل گئے ہیں۔ میرے فاضل دوست علی حسنین زیبا ردولوی مرحوم کہتے تھے کہ یہ غزل میر محمد تقی کی ہے جو لکھنؤ کے ایک داستاں گو اور شاعر بھی تھے۔ واللہ اعلم۔

ادیب صاحب نے میرے استصواب پر مجھے یہ خط لکھا:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

یہ میں نے اپنے وطن کے مشہور موسیقار مہدی حسن کو جن کے گلے میں ایک بھارتی نقاد کے قول کے مطابق "بھگوان" بولتے ہیں، اگرچہ خدا مجھے معاف فرمائے میں نے اس کا کچھ عرفان دوسرے وسائل کے علاوہ استاد فتح علی خاں کی نور کی آواز کے ذریعہ حاصل کیا، مطلع ہذا کے مصرعۂ ثانی کو بلا تکلف بار بار مست ہو ہو کر یوں ادا کرتے سنا اور حاضرین کو بے حد وحساب لطف اندوز ہوتے دیکھا "نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد!" تو سخن فہمی عالم بالا معلوم شد" کے ساتھ نہ صرف میرا ذوقِ سخن مجروح ہوا بلکہ موسیقی کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا۔

یہاں مجھے راس مسعود صاحب کے ذوقِ ظرافت کی ایک مثال یاد آ گئی۔ موصوف کی صحبت میں اُن کے نیازمندوں کو اُن کے ذوقِ شعر و ادب پر پورا پورا اعتماد ہونے کے سبب اُن کے زبان سے ہر اُردو یا فارسی شعر سن کر سر دھننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ایسے موقع پر موصوف کبھی فارسی کا ایک بیت سوقی لہک لہک کر پڑھ دیتے اور پھر حاضرین کی سرمستی کا حال دیکھ کر موصوف کو قہقہہ لگا کر بتانا پڑتا کہ وہ شعر تو بد مذاقی کا بدترین نمونہ تھا!

"ادبستان - دین دیال روڈ - لکھنؤ
۲۵ اگست ۵۲ء
مکرمی تسلیم

آپ کا ۲۱ اگست کا لکھا ہوا کارڈ ۱۸ اگست کو ملا۔
جس غزل کے بارے میں آپ نے دریافت فرمایا ہے اس پر میں نے ایک مضمون لکھ کر مدت ہوئی اپنے رفیق کار جناب آل احمد سرور کو دیا تھا کہ وہ اس کو "اُردو ادب" میں شائع کر دیں مگر وہ اس کو رکھ کر کہیں بھول گئے اور اب تک اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اب جب میں نے ان سے آپ کے خط کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ مضمون کھویا نہیں ہے۔ غالباً کسی کتاب میں رکھ دیا ہے اور وہ اسے تلاش کریں گے۔ اگر وہ مضمون مل گیا تو اس کی نقل آپ کو بھیج دوں گا ورنہ پھر کسی فرصت کے زمانے میں اسے دوبارہ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

میں یہ پتہ نہیں لگا سکا کہ اس غزل کا مصنف کون ہے۔ اس مضمون میں صرف یہ بتایا ہے کہ یہ غزل یا اس کے بعض اشعار کس کس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ اگر یہ اطلاع مطلوب ہو تو اس مضمون کو نقل کر کے یا اسے دوبارہ لکھ کے بھیج دوں اور اگر صرف اس غزل کے مصنف کا نام معلوم کرنا ہو تو وہ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا۔

مہربانی کر کے اس امر کی تحقیق فرما کر مجھے مطلع کیجئے، شکر گزار ہوں گا۔

والسلام
سید مسعود حسن رضوی"

افسوس کہ موصوف کا انتقال ہو گیا۔ نہ ان کے متذکرہ مضمون کی نقل ملی نہ کوئی دوسرا مضمون لکھ کر بھیجا اور سرورؔ[۵] صاحب کو کیا کہا

[۵] سرور صاحب کی ہندوستان سے پہلی بار کوئی دس بارہ برس پہلے کراچی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جاتے۔ غزل کے بعض اشعار کے دوسرے شعرا سے منسوب ہونے کا تو مجھے علم تھا جیسا کہ میں نے پہلے لکھا مگر غزل کے مصنف کے بارے میں صحیح تحقیق آج تک نہ ہو سکی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

ہیں آمد کے موقع پر ایک ادبی کالم نویس نے ڈان میں لکھا کہ موصوف نے انجمن ترقی اُردو کی اسٹینڈرڈ انگریزی۔ اُردو ڈکشنری کی تیاری میں حصہ لیا تھا۔ مگر یہ درست نہیں ہے۔ اس ڈکشنری کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا اور اس پر کئی برس پہلے سے کام ہو رہا تھا اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے مستند بزرگوں اُردو کے ان حروف کے الفاظ کے جنھیں بابائے اُردو نے ہندوستان کے بیسیوں اہلِ قلم میں تقسیم کر رکھا تھا، ترجموں پر نظرِ ثانی کر رہے تھے۔ علی گڑھ میں دو دو حروف سید سجاد حیدر اور رشید صدیقی صاحب کو بھی دیئے گئے تھے۔ اس سے بھی پہلے انجمن کے دفتر واقع اورنگ آباد دکن میں نظرِ ثانی کے کام کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس میں مولانا وحید الدین سلیم، سید ہاشمی فرید آبادی اور وہاج الدین احمد وغیرہ شامل تھے مگر وہ یہ کام آسانی سے نہ کر سکی۔ میرے مرتبہ "مکتوبات عبدالحق" میں بابائے اُردو کے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب مرحوم کے نام بعض خطوط میں اس کام کا ذکر ملے گا۔ یہ ۱۹۳۲-۳۴ء کے واقعات ہیں جب سرور صاحب زیادہ سے زیادہ یونیورسٹی کی ابتدائی جماعتوں کے طالب علم رہے ہوں گے۔ وہ ابتداً یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں ۱۹۳۶ء میں میرے حکومتِ ہند میں ملازمت پر چلے آنے کے بعد میری جگہ عارضی لکچرر مقرر ہوتے تھے۔

واضح ہو کہ مندرجہ بالا سطور اپنی جگہ پر ہیں اور ان کا سرور صاحب کی تخلیقی شگفتہ تنقید نگاری سے کوئی تعلق نہیں جس سے متاثر ہو کر راقم نے اپنے مجموعہ "تذکرے اور تبصرے" کو بڑے شوق کے ساتھ ان سے منسوب کیا ہے۔

ڈاکٹر ہادی حسن

میں اُن کا شاگرد کبھی نہیں رہا۔ مگر ۱۹۲۶ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد جب سجاد حیدر صاحب نے اپنی مہربانی سے مجھے لکھنؤ سے بہ اصرار دفتر رجسٹرار میں علی گڑھ بہ حیثیت مددگار بلا لیا[1] تو میری اور ہادی حسن صاحب کی دوستی ہو گئی۔ وہ دوستی کرنے میں پیش قدمی کرتے تھے اور اس معاملے میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ کرتے تھے۔ فریق ثانی کا انھیں پسند آجانا، خواہ مخواہ ہی سہی، شرط تھی اور بس۔

اُن کے لیے کسی کو اپنا دوست بنانا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ بلا کے حسین تھے اور ایک ناقابلِ بیان خوبصورت بلکہ بے پناہ مسکراہٹ سے، جو اُن کے شفاف اور سفید موتیوں کی طرح صاف دانتوں کی چمک ہر طرف بکھیر دیتی، جسے دیکھ لیتے وہ اسی وقت ہمیشہ کے لیے اُن کا ہو جاتا۔ اُسی کے ساتھ اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہی نہ تھی، اُن کے منہ سے پھول جھڑتے بھی تھے۔

علی گڑھ میں اساتذہ اپنے خالی گھنٹے زیادہ تر دو جگہ گزارتے تھے۔

---

[1] میں نے علی گڑھ سے بی اے اس سال کے موسم سرما کے اختتام پر پاس کر کے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ والد صاحب کو ان کے شدید دمہ کے مرض کی وجہ سے سرکاری ملازمت سے قبل از وقت پنشن دلا دی تھی اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ اُن کی مالی خدمت کرنا چاہتا تھا نیز اُن سے قریب بھی رہنا چاہتا تھا۔ میرے سابق وطن اناؤ اور لکھنؤ کے درمیان کم و بیش چالیس میل کا فاصلہ تھا۔ قانون کی تعلیم شام کو ہوتی تھی۔ میں نے دن کے وقت ماہ نامہ "الناظر" میں بہ حیثیت شریک مدیر ملازمت کر لی تھی۔ سجاد صاحب کو جن کے میرے ساتھ مربیانہ تعلقات بہت پہلے سے قائم ہو چکے تھے یہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے لکھا کہ مالی انتظام تو علی گڑھ میں خود ان

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یا تو لٹن لائبریری میں بشیر الدین؎، اسسٹنٹ لائبریرین کے پاس یا
یونیورسٹی کے دفاتر میں کسی کے پاس اپنے ذاتی کام سے یا خوش گپیوں کے
لیے میری اور ڈاکٹر ہادی حسن کی ملاقات شاید اُن کے کسی کام ہی کے سلسلے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

کے دفتر سے میرے متعلق ہو جانے کے بعد بھی ممکن تھا اور میرا لکھنؤ میں
قیام کسی طرح پسند نہ کیا۔ چنانچہ میں علی گڑھ واپس چلا آیا اور ایسا کہ پھر
۱۹۳۶ء تک وہیں کا ہو رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ شاید مضمون سے
اپنے مزاج کی نامناسبت کی وجہ سے ال ال بی نہ کر سکا۔ سجاد صاحب کو
علی گڑھ میں میری موجودگی غالباً اس لیے بھی پسند تھی کہ میں اور خواجہ
منظور حسین (مرحوم) میرے سینیئر ہم عصر اور دوست، اُن کے مضامین
اور ترجموں کی املا کرتے تھے۔ ویسے سجاد صاحب نے (راس مسعود صاحب
کی طرح جن کا ذکر آگے ایک حاشیہ میں آئے گا) جب میں علی گڑھ سے الٰہ آباد
یونیورسٹی ۱۹۳۱ء میں اردو میں ایم اے کرنے گیا تھا (یہ امتحان میں نے
۱۹۳۳ء میں اول درجہ میں پاس کیا تھا) جب کہ وہ علی گڑھ سے جا چکے تھے)
میری مالی امداد بھی کی تھی۔ ان پر نیز بعض دیگر اکابر پر بھی مضمون لکھنے کی تمنا
برس ہا برس سے دل میں لیے پھرتا ہوں۔ اے کاش مرنے سے پہلے پوری
ہو جائے۔ یہی دقت راس مسعود صاحب پر مضمون لکھنے میں پیش آئی تھی۔
ان کے الطاف بے پایاں سے دل اس قدر متاثر تھا کہ جب لکھنے بیٹھتا قلم
ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ ان پر شایانِ شان لکھنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ آخر
اُن کی وفات (۱۹۳۷ء) کے سالہا سال بعد پاکستان میں غالباً (۱۹۶۴ء
میں) ڈرتے ڈرتے برا بھلا اظہارِ خیال کر سکا (یہ مضمون بہ عنوان "ایک دل نواز
محسن" میرے مجموعہ "مرقع مسعود" شائع کردہ راس مسعود سوسائٹی کے اردو
حصہ میں شامل ہے)۔

؎ لیب بوائے سے ترقی کر کے اس عہدہ پر پہنچے تھے۔ بعد میں لائبریرین ہوئے۔
پہلے آنریری لائبریرین یونیورسٹی کا کوئی پروفیسر ہوا کرتا تھا اور ہادی حسن

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یں ہوگئی جب وہ سجاد صاحب یا اسسٹنٹ رجسٹرار ابو الحسن[۱] بیرسٹر ایٹ لا کے پاس آکر بیٹھتے تھے۔

باکمال اور مستند فارسی داں بلکہ اہلِ زبان ڈاکٹر ہادی حسن، نواب محسن الملک کے برادر زادے تھے، سرخ و سفید، نرم و نازک[۲] شمشاد قد، شیروانی اور چوڑی دار پاجامے، نیز سوٹ دونوں ہی لباس ان پر خوب کھلتے تھے۔ پنس نیز لگاتے اور سیاہی مائل قدرے سخت فلٹ کی لانبی ترکی ٹوپی، داہنی طرف ذرا جھکی ہوئی اوڑھتے تھے جس کا پھندنا چلتے میں ہلتا رہتا۔ مخاطب کی کمر میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر جانی جانی کہہ کر بات کرتے تھے۔ کوئی اُن کے پاس کتنا ہی متردد اور پریشان جاتا شاداں و فرحاں واپس آتا، میرے اس شعر کا مصداق ؎

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

صاحب بھی رہ چکے تھے۔ بشیر الدین بشیر کا لیے مشہور تھے اس لئے کہ بہت کالے تھے مگر اس قدر صاف ستھرے، ناک نقشے اور چہرے مہرے سے درست اور خوش وضع اور خوش پوشاک بلکہ جامہ زیب تھے کہ اُن کی طرف دل کھنچتا تھا۔ ادبیات کے بڑے شوقین تھے اور کم و بیش ہر علم پرنئی اور پرانی کتابوں سے واقف واقفیت تھی نیز اُن کے حوالوں پر عبور تھا۔ چنانچہ ضرورت مند طلبا ہی نہیں بشرطِ خواہش و ضرورت اساتذہ بھی اُن سے استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے میرے اور خواجہ منظور کے ساتھ غالباً چند روسی انسانوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

[۱] اب انھیں ڈھونڈھ چراغ رخِ زیبا لے کر! (اقبال)

[۲] اُن کے ہر وقت تازہ استری کئے ہوئے انگریزی لباس کی وجہ سے جس پر غیر ضروری شکن نہ آجانے کی کوشش میں وہ کم و بیش سارا وقت بیٹھتے بھی ایک خاص انداز ہی میں تھے لوگ موصوف کو لارڈ ہیملٹن کہتے تھے۔ لارڈ کچنر کے انداز کی خوب گھنی، سیاہ اور پورے ہونٹوں کو ڈھانک لینے والی مونچھیں تھیں۔ مرادآباد کے رہنے والے تھے مگر دیسی پن انھیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔

لائے ہیں ساتھ دولتِ صبر و قرارِ دل
بیٹھے ہیں آپ کے درِ جنت نشاں سے ہم!

جس کا ساتھ دیتے آنکھ بند کرکے اس کے ہو جاتے۔ کوئی اُن کے دوست کے خلاف اُنھیں بھڑکا نہ سکتا تھا۔ اپنے دوست کی ہمیشہ تعریف ہی کرتے۔ پسندیدہ طلباء کو سرٹیفکیٹ دیتے تو توصیف میں قلم توڑ دیتے۔ شعبۂ اُردو میں میری تقرری سے قبل میری اُمید و بیم کی کیفیتوں کو دیکھ کر بڑے جوش کے ساتھ تسلی دیتے۔ اپنے دل لوٹ لینے والے انداز میں جو اُنھیں پر ختم تھا کہتے "جانی! یہ جگہ تمھارے ہی لیے نکالی گئی ہے۔ جانی! تم اس جگہ پر مقرر ہونے ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے"۔ وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب ابتداً چند دن کیمسٹری کے استاد رہے بعد میں فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے جو اُن کی اصل لائن تھی۔ "ایرانی جہاز رانی کی تاریخ" (A HISTORY OF PERSIAN NAVIGATION) اُن کی ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع تھا۔ اور اُن کا انگریزی زبان میں یہ مقالہ بڑے سائز کی ایک ضخیم کتاب کی شکل میں آرٹ پیپر پر اور باتصویر شائع ہوا تھا۔ فردوسی کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر یونیورسٹی کی طرف سے ایران گئے تھے اور وہاں اپنی قابلیت کا لوہا منوا کر اور اپنے حسن تقریر کے جھنڈے گاڑ

لے بے شک اُنھیں معلوم تھا کہ سر راس مسعود نے علی گڑھ کے وائس چانسلر ہی فنڈ سے (جو شاید تمام یونیورسٹیوں میں اس نام کا اور اپنے نام کے اعتبار سے پہلا فنڈ تھا اور اس کے تصرف کے تنہا وہی مختار و مجاز تھے۔ بجٹ میں اس کا ذکر نہیں آتا تھا' اس لیے کہ وہی اپنے دوستوں سے لڑ جھگڑ کر بلکہ فرماتے تھے اُن کی جیبوں سے زبردستی نکال کر روپیہ لاتے) الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایم اے اُردو کی تعلیم کے لیے مجھے روپیہ دیا تھا۔ یہ بھی پہلا اور شاید آخری واقعہ تھا کہ ایک یونیورسٹی کے فنڈ سے کسی دوسری یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی طالب علم کی مالی امداد کی گئی ہو۔ جس کے لیے کتنے دنوں انھیں یونیورسٹی کورٹ کے بعض ارکان کی صلواتیں بھی سننی پڑی تھیں۔ میری مزید امداد انھوں نے قاضی سر عزیز الدین احمد سی آئی ای' وزیر اعظم ریاست دتیا سے بھی کرائی تھی۔

کر واپس آ سکتے تھے۔ مگر وہ اپنی قابلیت سے قطعی بے خبر تھے۔ غرور اُن میں نام کو بھی نہیں تھا۔ ایران سے واپسی پر انھوں نے اسٹریچی ہال میں ایک شام تہران میں اپنی کارگزاری اور فردوسی کے یادگاری جشن پر نہایت فاضلانہ تقریر کی تھی، ایک ہی وقت میں، اہل زبان کی ایرانی اور انگریزی میں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقریر کے خاتمہ پر مجمع نے اُن سے اپنی شیفتگی کے اظہار میں ہلّہ بول دیا تھا اور نہ جانے کتنوں نے اُن کے خوب خوب بڑھ بڑھ کر بوسے لیے۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے دونوں گال چومے جانے کے لیے پیش کرتے رہے۔ ہال سے باہر نکلنے پر کسی نے پوچھا کہ اپنی تقریر کے بارے میں خود اُن کی کیا رائے تھی تو مسکراتے ہوئے اپنی شہادت کی انگلی سے انگریزی "زیرو" (صفر) کی شکل کا ہوا میں ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا جس کا مطلب تھا کہ ایک فضول اور بے معنی سی تقریر۔

اُن کی بیگم کشور جہاں صاحبہ جنھیں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ڈاکٹریٹ کا مطبوعہ مقالہ معنون کیا تھا، صورت شکل میں اُن کے برعکس تھیں مگر حسن اخلاق میں اُن سے کم مالا مال نہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک سنگین علالت میں موصوفہ نے اُن کی بے لوث خدمت کی تھی جس کی بنا پر وہ اُنھیں دل دے بیٹھے اور ہمیشہ کے لیے اُنھیں کے ہو گئے تھے۔ ابتدائی ایجاب و قبول کی شان بھی نرالی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "آپ مجھ سے کیا تحفہ لینا پسند کریں گی؟" موصوفہ بولیں "میں آپ کو لینا پسند کروں گی!"۔ اُن کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے اپنے سارے خاندان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔

میں سمجھتا تھا مجھے اُن کی طلب ہے اصغر
کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو!

تعلیم کے اوقات کے علاوہ گھر ہو یا گھر سے باہر دونوں اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ میں صاحب باغ کے صدر دروازے پر واقع دو مکانوں میں سے ایک میں رہتا تھا۔ دوسرے مکان میں حکیم عبداللطیف (جھنوائی ٹولہ، لکھنؤ والے، بعد میں شفاء الملک اور پرنسپل طبیہ کالج ہوتے) قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم، صاحب باغ کی

باہر والی سڑک پر منٹو سرکل جاتے ہوئے چوراہے پر "جعفر منزل"[1] میں مقیم تھے۔ میری زندگی کے چند بہترین شامیں وہاں اُن کے ساتھ گزریں جن کی یاد آج تک دل سے نہیں جاتی۔ بلکہ غلط نہ ہوگا اگر بقول عندلیب شادانی یہ کہوں کہ ؎ انھیں کی یاد میری زندگی ہے!

دونوں میاں بیوی شام کو چراغ جلے چہل قدمی کو نکلتے۔ صاحب باغ کی طرف آتے ہوئے میرے مکان پر مجھے آواز دیتے یا میں "جعفر منزل" چلا جاتا۔ ہم تینوں کی اکٹھا سیر ہوتی یا صاحب باغ والی سڑک ہی پر ہماری چہل قدمی ہوتی۔ صاحب باغ کے صدر دروازے کے بالکل مقابل سڑک کی دوسری طرف خواجہ غلام السیدین کی نوتعمیر کوٹھی تھی جس کے سامنے سرسبز لان پر وہ اپنے اہالی موالی کے ساتھ بیٹھے ہوتے۔ میں کبھی وہاں چلا جاتا جس کا تذکرہ سیدین صاحب پر اپنے مضمون میں کر چکا ہوں[2]۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہوتا تو سڑک ہی پر ٹہلتا۔ بیگم ہادی حسن پردہ نہیں کرتی تھیں وہ ساڑھی باندھتی تھیں مگر اسے ٹخنوں سے کچھ اوپر لٹکاتی تھیں۔ اس کا شرع سے کوئی تعلق نہ تھا بس یہ ایک نیا فیشن اُن دنوں نکلا تھا جو زیادہ دن نہیں چلا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اُس وقت تک پردہ کا سخت رواج تھا۔

---

[1] "جعفر منزل" خان بہادر سید جعفر حسین صاحب، میجر جنرل سید شاہد حامد (مرحوم) کے نامور دادا، کی کوٹھی تھی جو انھوں نے علی گڑھ کی محبت میں یونیورسٹی کو نذر کر دی تھی۔ موصوف سرسید کے خاص الخاص دوستوں میں تھے۔ تعمیر کے فن میں انھیں استادرک تھا اور مؤخر الذکر کو اُن پر اتنا اعتماد کہ اس زمانے کی عمارتیں تقریباً تمام کی تمام سرسید کی خواہش کے مطابق موصوف کی نگرانی میں تعمیر ہوئیں۔ ایک خاص وضع کے بزرگ تھے اور علی گڑھ کے اس قدیم حلقہ سے متعلق تھے جس کے ارکان وہاں کے عرف عام میں "مائی لارڈز" کہلاتے تھے۔ راقم نے انھیں اولڈ بوائز کے سالانہ جلسوں میں دیکھا تھا۔
؎ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ! (میر)
شاہد حامد مرحوم نے اُن پر ایک نہایت شاندار اور کمیاب کتابچہ شائع کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو میرا مجموعۂ مضامین "چند اکابر چند معاصر"۔

صرف بمبئی میں عطیہ فیضی یا طیب جی کے خاندان میں یا پنجاب میں سر محمد شفیع کے گھر سے جو حکومت ہند کے لا ممبر تھے پردہ اٹھ چکا تھا۔ علی گڑھ میں تین گھر تھے جہاں کی خواتین میں پردہ کا رواج نہ تھا۔ مگر یہ "نیمے دروں نیمے بروں" قسم کی بے پردگی تھی۔ ایم ایم (میاں محمد) شریف، پروفیسر فلسفہ (جو میاں شفیع ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ہادی حسن اور سجاد حید صاحب۔ ان کے گھروں کی خواتین باہر نکلتی تھیں مگر چوری چھپے، شام کے بعد، تاروں کی چھاؤں میں۔ آپس ہی کے مردوں سے اُن کے یا اپنے گھروں میں ملتی تھیں۔ دن کے وقت برسرِ عام نہیں نکلتی تھیں۔ اکبر نے ایسی ہی بے پردگی کے بارے میں کہا تھا ؎

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون ساحق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسایہ کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی مگر میں بیگم ہادی حسن اور مسز شریف کے گھروں میں آزادی سے آتا جاتا تھا۔ مؤخر الذکر اور ان کی دو بیٹیاں گلشن اور غالباً عفت بھی جو بعد میں علی الترتیب بیگم خواجہ منظور حسین اور بیگم میاں افتخار الدین ہوئیں معہ پروفیسر شریف مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہاں نذر سجاد مجھ سے پردہ کرتی تھیں جو بعد میں سجاد صاحب کے رجسٹرار کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ سے یوپی میں بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر واپس جانے پر ہردوئی (اودھ) میں اٹھا جہاں میں اپنے ایک عزیز سے ملنے گیا تھا اور دونوں میاں بیوی بھی وہیں تھے۔ کہتی تھیں علی گڑھ میں نہ جانے کیوں میں یہ سمجھتی رہی کہ آپ میرے سامنے آنا پسند نہیں کریں گے۔ پھر تو انھوں نے میری والدہ کی جگہ لے لی۔ سجاد صاحب تو والد سے بڑھ کر پہلے ہی ہو چکے تھے۔ علی گڑھ میں پروفیسر اور مسز شریف نے میری شادی کے بعد ہم میاں بیوی کی بڑی پر تکلف دعوت کی تھی اور میری بیوی کا پردہ ترک کرا دیا تھا۔

۱۳۴۴

پروفیسر عبدالمجید قریشی

۱۱ جون ۱۹۸۲ء کو صبح ساڑھے سات بجے انگریزی روزنامہ ڈان کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے مختصر سی یہ خبر پڑھی کہ پروفیسر عبدالمجید قریشی کا گزشتہ شب انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا جو بیان سے باہر ہے، جیسے بس

ع دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من!

ملال اس کا بھی ہوا کہ اخبار نے مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور خبر کو کما حقہٗ اہمیت نہیں دی، پھر بھی غنیمت ہے کہ چھاپ دیا ورنہ ہمارے بعض اخبار ہمارے متعدد ناموراہلِ علم وفن کو بغیر آنسو بہائے، بغیر فاتحہ پڑھے دفن کر چکے ہیں۔

برسوں پہلے کی بات ہے۔ سرگودھا کے ایک بہت بڑے جلسے میں باہزاراں کروفر اُس زمانے کے صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آراستہ و پیراستہ ڈائس پر مائک کے سامنے اپنا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور جملہ حاضرین گوش برآواز تھے کہ ایک بار موصوف کی نظریں جو اُٹھیں تو دیکھا کہ شرکائے جلسہ کی پچھلی صفوں میں قریشی صاحب تشریف فرما ہیں۔ ایوب صاحب نے اسی وقت اپنی تقریر موقوف کردی۔ کاغذات میز پر چھوڑ دیئے اور حاضرین کو محوِحیرت بناتے ہوئے کسی رسمی تکلف یا پس وپیش کے بغیر ڈائس سے نیچے اُترے اور سیدھے قریشی صاحب کے پاس پہنچے۔ اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے انھیں اپنے ساتھ لا کر ڈائس پر اپنی کرسی کے ساتھ والی کرسی پر بٹھادیا۔ یہ تھے ہمارے بہت پیارے قریشی صاحب جنھیں میں نے "بہت پیارے" لکھ دیا اُن کے زمانے کے بہت سے طلبا اُن کے سامنے بیٹھنے کی جرأت نہ کرسکتے تھے اور ان سے بات کرتے جھجکتے تھے، خوف سے نہیں اُن کی سخت گیر مگر کھری اور پیار بھری درشتی سے۔

اُن کا پورا تو نہیں کسی حد تک مکمل تعارف یوں سمجھئے: خان بہادر پروفیسر ایم (عبدالمجید) قریشی، علی گڑھ کے معمر ترین اولڈ بوائے، رکن مسلم

یونیورسٹی کورٹ وا یکزیکٹو کونسل، ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے بعد جامعہ علی گڑھ اور اس کے باہر ریاضیات کے مشہور ترین استاذ بعد میں صدر شعبۂ مذکور، پرنسپل مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج، ایکس اسٹوڈنٹس سوسائٹی (جو طلبا کو قرضِ حسنہ دیتی تھی) شریک معتمد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ وغیرہ۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں جب میں علی گڑھ میں داخل ہوا تو انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل میجر ڈین تھے۔ جلد ہی وہ یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ کے صدر ہوگئے اور ان کی جگہ قریشی صاحب پرنسپل مقرر ہوئے۔ اُن کی اس زمانے کی پُر وقار شخصیت کی دو چیزیں نہایت ممتاز تھیں۔ ایک تو ان کی خوب گھنی لانبی اور نکیلی سیاہ مونچھیں، دوسری لانبی ہی قدرے سیاہی مائل نرم نز کی ٹوپی جو ان کے سر کے بائیں طرف قدرے جھکی رہتی تھی۔ وہ تن و توش کے اعتبار سے درمیانی مگر لمبائی میں خاصے نکلتے ہوئے انسان تھے۔ خواہ سوٹ پہنیں خواہ شیروانی دونوں لباس ان پر خوب کھلتے تھے۔ وہ سینہ تان کر جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے چلتے تھے۔ جنھوں نے انھیں پاکستان میں ان کے بڑھاپے اور آخری ایام میں دیکھا وہ ہمارے علی گڑھ کے جوان اور رعب داب والے، اپنی ایک خاص آن بان رکھنے والے قریشی صاحب کو جان ہی نہیں سکتے۔

اُن کی پُر وقار شخصیت کے ساتھ ان کی انتظامی قابلیت اور طلباء اور کالج کے ساتھ ان کی بے پناہ محبت و شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار سیّد قاسم رضوی کی سرکردگی میں (جو کالج کی فٹ بال ٹیم کے کپتان تھے) کسی معاملہ پر طلباء کی اسٹرائک ہوئی۔ قریشی صاحب نے طلباء کو منٹو سرکل کے باہر میدان میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اپنی مخصوص آن بان کے ساتھ تشریف لائے۔ رضوی اور صرف دو طلبا سے شکایات سنیں اور اپنی ٹوپی اتار کر طلبا کی طرف پھینک دی جسے قاسم رضوی نے آگے بڑھ کر لپک لیا۔ پھر ایک مختصر سی تقریر کی جس کے یہ جملے مجھے آج تک یاد ہیں "مجھے اپنے کالج کی ایک ایک اینٹ سے محبت ہے اور میں اپنی نیک نامی سے ہاتھ دھو لوں گا کالج کو ہرگز ہرگز بدنام نہ ہونے دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم جب یہاں سے نکل کر زندگی میں داخل ہوگے کالج کے لیے تمھارے دل کی بھی یہی کیفیت ہوگی۔" اس کے بعد انھوں نے قاسم رضوی اور انہی دونوں طلباء کو اپنے دفتر میں بلایا۔ جس کے بعد اسٹرائک ختم

ہوگئی۔ شاید دو دن سے زیادہ نہیں رہی۔ معلوم نہیں طلبا کو کیا گھول کر پلا دیا۔ کسی نے بھی تو پھر اسٹرائک کا نام نہیں لیا، سب کام حسبِ معمول ہوتے رہے۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کسی قسم کی گڑبڑ ہوئی تھی۔

سچ پوچھئے تو وہ علی گڑھ کے ایک مثالی سپوت تھے۔ اس کے نام پر مرتے اور اس پر کسی طرح کی آنچ آتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پاکستان بننے کے کچھ دن بعد ڈان اخبار نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے بارے میں ایک مضمون چھپا جس کے ایک حصے سے مجھے اختلاف تھا۔ میں نے اس کے جواب میں ڈان ہی میں ایک خط شائع کیا جس میں رحمت اللہ تحقیقاتی کمیٹی کے بیانات کی روشنی میں اُن بیانات کی تردید کی نیز اپنے زمانے کے علی گڑھ میں ڈاکٹر صاحب اور راس مسعود صاحب کی پالیسیوں کا اختلاف دکھا کر مؤخر الذکر کے بارے میں تحسینی کلمات استعمال کیے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا ایک یہ انداز تھا کہ جتنی محکم بات ہوتی اتنے ہی محکم انداز سے اس پر گفتگو کرتے جس کے بعد سننے والے میں جواب کی سکت نہ رہتی۔ مجھے پاس بلا کر بولے "یہ تم نے کیا گڑے مُردے اکھیڑنے شروع کیے ہیں"۔ جب میں نے کہا کہ ابتدا فریق ثانی کی طرف سے ہوئی تھی اور میرے لیے اعلائے حق ضروری تھا تو قدرے درشتی سے فرمایا "تم سمجھتے ہو کہ نیکی کرنے کے صرف بندھے ٹکے ہی چند طریق ہوتے ہیں۔ نیکی سو طریق سے کی جاتی ہے اور ہر وہ طریق جائز ہے جس سے نیکی کے کامیاب نتائج ظاہر ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اب کہ علی گڑھ میں اپنے پرانے اعمال کی جزا و سزا کے لیے دونوں فریق مالکِ حقیقی کے سامنے موجود ہیں تم کو خدائی فوجدار کس نے بنایا ہے؟" پھر فرمایا اور عجیب شانِ سرشاری کے ساتھ کہا "تمہیں شخصیتوں سے زیادہ اپنی مادرِ علمی کی عزت و وقار کا خیال ہونا چاہیئے۔" آپ یقین مانیں میری نہ صرف آنکھیں کھل گئیں، بلکہ

ع اکبر زمین میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

میں زندگی میں اس وقت سے زیادہ اپنے عمل پر کبھی شرمسار نہیں ہوا تھا۔ میرے پاس مرحوم کے دلائل کا کوئی جواب نہ تھا اور

ع میں بت پرست ہوں، رکھ دی کہیں جبیں میں نے! (اقبال)

میں اُن کا طالب علم کبھی نہیں رہا مگر اس زمانے میں مجھے بھی اساتذہ اور طلباء سے تعلقات قائم کرنے نیز ادب و شعر کے خدمت گزاروں سے متعارف ہونے کا قدرتی طور پر بے حد شوق تھا۔ اپنے زمانے میں قریشی صاحب نے انٹرمیڈیٹ کالج میں کئی شاندار مشاعرے منعقد کروائے اور ان کی کامیاب صدارت کی تھی جن کا ریکارڈ انٹر کالج میگزین کی اشاعتوں میں محفوظ ہے۔ پرنسپل ہونے سے پہلے وہ یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد تھے اور انٹرمیڈیٹ کالج ٹوٹنے کے بعد یونیورسٹی واپس آنے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے بجائے (جنھوں نے صرف وائس چانسلری سے سروکار رکھنے کا تصفیہ کیا تھا) اور آندرے وائل کے چلے جانے کے بعد جسے اپنے زمانے میں فرانس سے راس مسعود صاحب لائے تھے، صدرِ شعبۂ ریاضیات مقرر ہوئے۔ جہاں تک یاد آتا ہے میرے علم میں سائنس کے شعبہ جات میں اس وقت علی گڑھ میں پروفیسر فیروز الدین مراد اور جناب خلیل مراد کے علاوہ اُردو زبان و ادب سے قریشی صاحب کو بڑی دلچسپی تھی اور انھوں نے علی گڑھ میگزین میں نظریۂ اضافیت پر اُردو میں ایک سلسلۂ مضمون شائع کیا تھا جس نے ان کی شہرت مضمون نگاری کے میدان میں بھی دور دور پہنچا دی۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اُردو میں اس موضوع پر یہ پہلا مفصل و مشرح مضمون تھا جس کا عنوان قریشی صاحب نے "نظریۂ نسبیہ" رکھا تھا اور اگرچہ مشہور ادیب سجاد انصاری صاحب نے حسبِ معمول اپنے بے پناہ طنزیہ انداز میں خواجہ منظور حسین صاحب کو (جن سے بڑھ کر قابل ایڈیٹر میگزین کو نصیب نہیں ہوا) اپنے ایک خط میں لکھا تھا[1] "نظریۂ نسبیہ کو خدا نہ کرے میں سمجھی سمجھوں۔ نفس موضوع درکنار میں عنوان ہی سے مانوس نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس بندش کا مفہوم کیا ہے۔ شاید یہ کوئی آہنی سپر ہے جو مسئلہ زیرِ بحث کی عصمت و عفت نامحرم نگاہوں سے مخفی رکھنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ بہرحال جو کچھ الزام ہے وہ میری کج فہمیوں پر جو خشک مسائل سے بے تکلف ہونا نہیں چاہتیں۔" تاہم علمی و تحقیقی حلقوں میں قریشی صاحب نے اس مضمون سے بڑا نام پیدا کر لیا تھا۔ بعد میں اس مسئلہ پر سر شاہ محمد سلیمان کی

---

[1] یہ خط سجاد انصاری مرحوم کے مجموعۂ مضامین "محشرِ خیال" میں شامل ہے۔

تحقیقات کا بھی کچھ دن چرچا رہا۔ بے شک خالص ادبی مذاق رکھنے والوں کے لیے آج بھی اس موضوع میں جس کا ڈاکٹر سلام نئی تحقیقات کے بعد ہے جس پہ انھیں نوبل انعام ملا ہے بہر شہرہ ہو ہے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

تعلیمی موضوعات پہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے ان سے کئی ضخیم اعلیٰ درجہ کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرا کے شائع کی ہیں۔ ان سے بھی قریشی صاحب کے علمی مذاق اور اُردو میں خشک مضامین کو منتقل کرنے میں جو دردسری ہوتی ہے اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ان اوصاف نیز جیسا کہ پہلے عرض کر چکا اساتذہ سے میل جول بڑھانے کے اپنے شوق کی بنا پر علی گڑھ میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ سہ پہر کے وقت اپنے ماریسن روڈ کے کنارے والے مکان کے (میرس روڈ پر ان کی اپنی کوٹھی ابھی تیار نہیں ہوئی تھی) چھوٹے سے ہرے بھرے لان میں سفید براق ململ کے کرتے اور علی گڑھ کٹ کے تنگ پاجامے میں میز کے ساتھ کرسی پہ بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ میز پہ ایک طرف ان کا کیش بکس کھلا رکھا ہوتا تھا اور دوسری طرف کاغذات اور فائلیں۔ کام بھی کرتے جاتے اور احباب اور طلبا سے باتیں بھی۔ اس وقت علی گڑھ، علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کی بڑی بڑی شخصیتوں کے حالات اور ان میں سے بعض کے بارے میں ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات کا بیان سننے والے کے لیے ایک نہایت دلچسپ بلکہ روح پرور تجربہ ہوتا تھا۔ سرسید اور سید محمود کی تصویریں دکھا کر فرماتے "اب تو ہم میں ایسے چہرے مہرے اور رنگ و نقش بھی نہیں باقی رہے، دل و دماغ کی باتیں تو دور کی ہیں!"

اردو روزمرہ اور محاورہ پہ انھیں نہایت اچھا عبور تھا اور اگرچہ لہجہ پنجابی تھا وہ نہ صرف شین قاف اور تذکیر و تانیث کے اعتبار سے پاکیزہ اور شستہ و رفتہ اُردو بولتے تھے بلکہ میں تو ان کی اُردو کو مستند اور اہلِ زبان کی ٹکسالی اُردو سمجھتا ہوں۔ پنجاب میں شیخ عبدالقادر اور مولانا ظفر علی خاں کو یہ خاص امتیاز حاصل تھا کہ لہجہ اور زبان دونوں سے غیر اہلِ زبان نہیں معلوم ہوتے تھے۔ قریشی صاحب کے لہجہ کو درگزر کر دیا جاتے تو اُن کے اہلِ زبان ہونے میں کیسے تامل ہو سکتا ہے۔ اس زمانے کا ان کا

ایک جملہ مجھے آج تک یاد ہے جو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتا ہوں۔ ان کے پاس ان کے کوئی ماتحت استاد یا دفتر کے کوئی صاحب بیٹھے تھے۔ شاید ان کا ریکارڈ کئی حیثیتوں سے قابلِ اعتراض تھا اور وہ قریشی صاحب سے اسے درست کرانا چاہتے تھے۔ قریشی صاحب نے ایک بار اپنے اوپر انتہائی جبر کر کے لیکن الفاظ کو چبا چبا کر کہا "بھائی۔ چھوٹا موٹا رفو کا کام ہو تو میں ہر وقت تیار ہوں مگر تمھارے بُغارے میں کہاں تک بھروں"۔ مجھے اس وقت مصحفی کا مقطع یاد آ گیا؎

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

آج کل کے بہت سے استادوں تک کے لیے شاید "بُغارہ" کا لفظ اجنبی ہو۔ کپڑا مسک جائے تو رفو کرنا آسان ہے مگر کپڑے میں بڑے بڑے چھید ہو جائیں تو ان کا بھرنا مشکل ہوتا ہے۔ ان بڑے بڑے چھیدوں کو "بُغارے" کہتے ہیں جیسے کسی دیوار میں کئی اینٹیں نکل جانے سے بڑا شگاف ہو جائے تو اسے "بھمبھاقا" کہیں گے۔

علی گڑھ سے ریٹائر ہونے اور پاکستان بننے کے بعد وہ اپنے وطن بھیرہ میں مقیم ہو گئے تھے مگر کچھ دن بعد اپنے علاقے کے صدر مقام سرگودھا میں آکر رہنے لگے۔ جب میں غالباً ۱۹۶۲ء میں اپنے بیٹے خالد سلمہٗ کو پی اے ایف کالج سرگودھا داخل کرانے لے گیا۔ وہ سرگودھا میں تھے اور عرصۂ دراز کے بعد مجھے ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ انھوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی اور میرے دل میں ان کی شفقتوں کی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ پھر وہ کراچی تشریف لے آئے اور اپنے مقبول آباد والے مکان میں مقیم ہو گئے۔ یہاں اگرچہ دیر دیر میں اُن کی خدمت میں میری حاضری ہوتی مگر دل کو اطمینان ہو گیا تھا کہ جب چاہیں گے ان سے ملاقات کر لیں گے۔ افسوس کہ علی گڑھ والا اطمینان تو کبھی نصیب نہیں ہوا مگر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں ان سے

؎ اب بریگیڈیر خالد احمد قدوائی۔ سرگودھا، پی اے ایف کالج ترک کر کے اُس نے پاکستان ملٹری اکاڈمی کاکول سے کمیشن حاصل کیا۔

ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ کبھی سید الطاف علی بریلوی کے ذریعہ نامہ و پیام ہو جاتا تھا، کبھی وہ میرے گھر پر کسی تقریب کے سلسلے میں تشریف لے آتے مگر کم، کیونکہ سواری اور ہمراہی کی دقتیں تھیں۔

میری ایک بچی ڈاکٹر گوہرین کی شادی میرے مرحوم دوست پیر زادہ محمد اکرم مخدومی (پرنسپل سنٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج لاہور، بعدہٗ ڈائریکٹر ایجوکیشن لاہور) کے چھوٹے بیٹے زاہد سے ہوئی۔ آپ ان کی منگنی کی تقریب میں تشریف لائے اور دیر تک بیٹھے، نیز علی گڑھ کے دو سابق طلبا اور دوستوں کے خاندانوں میں رشتہ قائم ہونے پر مبارکباد دی۔ اس موقع پر خواتین کے اصرار پر ایک ڈومنی بلائی گئی تھی۔ انعام لینے کے لالچ میں وہ اندرون خانہ سے مردانے میں ناچتی گاتی چلی آئی۔ آپ نے دیکھا تو مجھ سے بولے "مجھ سے تو اس عمر میں یہ چونچلے نہیں دیکھے جاتے!" اور واپس تشریف لے گئے۔

مجھے راس مسعود سوسائٹی کے قیام پر مبارکباد دیتے تھے اور چندہ بھی دیا۔ شاید اس کے دو ایک جلسوں میں شرکت کی۔ ان کی صحت خراب ہو رہی تھی اور آنکھوں کا آپریشن بھی ہوا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی پرانی خوب صورت شخصیت کا محض ایک سایہ ہو کر رہ گئے تھے۔ مگر ان کے دولت خانہ پر حاضری کے موقع پر ان کے بڑے کمرے میں علی گڑھ کی شخصیتوں اور وہاں کے اجتماعات کی بے شمار تصویروں کو دیکھ کر میں اور میری تحریک پر مجھ سے زیادہ خود وہ بھی وہاں کے پرانے ماحول میں گم ہو جاتے تھے بلکہ ان پر افسردگی طاری ہو جاتی تھی۔

میں نارتھ ناظم آباد میں رہتا تھا جہاں سے ان کی قیام گاہ کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ میرے پاس اس زمانے میں سواری نہ تھی اور فی الجملہ وہ میرے لیے کسی حد تک آزمائش کا زمانہ بھی تھا۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے کچھ دنوں بعد میں نے اپنے کو سالہا سال تک باقاعدہ انجمن ترقی اردو سے وابستہ کر دیا۔ پھر زندگی کے دوسرے بیسیوں جھمیلے تھے اور خرابیٔ صحت وغیرہ۔ ایک بار ان سے ملاقات کو غیر معمولی طولانی عرصہ گزر گیا اور مجھے اپنے اس جرم کا اتنی شدت سے احساس ہوا کہ کسی ساتھی کی تلاش ہوئی جو قریشی صاحب کے حضور میری مجبوریوں کی تائید کر سکے۔ مگر کوئی ساتھی نہ ملا تو ہمت کر کے میں تنہا پہنچ گیا اور کسی ساتھی کے نہ ملنے کو تاخیر سے حاضر ہونے کا بہانہ بنا کر

میں نے شادؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

خود چل کے اس کوچہ میں چلنا ہے جو اے پائے طلب
کوئی واں ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جانے کا!

دل گیر تھے۔ فرمایا "ٹھیک کہتے ہو، مگر اس غزل کا مقطع کیوں نہیں پڑھتے جو میرے حسبِ حال ہے" ؎

شادؔ آخر ہے شب اور پاؤں میں طاقت ہے ابھی
اس سرا سے ہے یہی وقت نکل جانے کا!

ان کا حافظہ ہمیشہ کا قوی تھا، مگر میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُنھیں شادؔ کے کلام سے مزاولت ہوگی کیونکہ شعر و شاعری پر ان سے مجھے اپنی کوئی گفتگو یاد نہیں آتی۔ میں نے مقطع نہیں پڑھا یہ کہہ کر کہ بے موقع ہے تو فرمایا "تمھاری بے التفاتی کا یہی حال رہا تو موقع آتے کیا دیر لگتی ہے۔" میں بے حد نادم ہوا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کے یہ الفاظ ملہم غیبی کی آواز تھے۔ میں کئی سال سے ناظم آباد سے منتقل ہو کر گلشن اقبال آگیا تھا* جہاں سے ان کی جائے قیام خاصی قریب تھی اور میں نے انجمن سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ یعنی مجھے فرصت تھی مگر بیرون پاکستان سیاحت اور پھر حج بیت اللہ شریف کے معاملات آگئے اور میں اُن کی خدمت میں نہ حاضر ہو سکا تا آنکہ وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کی روح سے کتنی شرمندگی ہے۔ اب تہہ دل سے ان کی مغفرت کی دُعا کرتا ہوں۔

خواجہ منظور حسین

علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ کے سال اول یعنی ۱۹۲۲ء ہی میں خوش قسمتی سے مجھے یونیورسٹی کی ایک بے مثال اور ناقابلِ فراموش شخصیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگیا۔ میری مراد میرے محترم اور نہایت فاضل دوست خواجہ منظور حسین سے ہے جو اس وقت وہاں بی اے سال اول میں انگریزی اور اردو کے نامور ترین طالب علم تھے۔ وہ انگریزی ادب کی تازہ ترین کتابیں بلیک ویلس، لندن (BLACKWELLS, LONDON) سے براہِ راست منگاتے تھے۔ زندگی میں آج تک میں نے ایسا کوئی اور طالب علم نہ دیکھا نہ سنا۔ اور اردو کی بھی شاید ہی کوئی تازہ قابلِ ذکر کتاب ایسی ہو جسے وہ جلد سے جلد بلکہ ممکن ہو تو سب سے پہلے نہ خریدیں۔ "افاداتِ مہدی" کا پہلا ایڈیشن آنٹ پیپر پر بڑے سائز میں اور "بانگِ درا" کا پہلا ایڈیشن بھی، دبیز غالباً آفسٹ پیپر پر دونوں ۱۹۲۴ء اسی طرح خریدے گئے تھے۔ بعد میں وہ علی گڑھ اور لاہور میں ہر دو زبانوں کے مستند عالم مانے گئے اور اول الذکر کے سارے پاکستان میں چوٹی کے استاد رہے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور ریٹائر ہونے پر انٹر یونیورسٹی بورڈ پاکستان کے سیکرٹری رہے۔

دراصل انھیں اپنا دوست کہتے ہوئے مجھے پس و پیش ہوتا اور حجاب آتا ہے۔ وہ میرے مرشد، مخدوم، استاد (کلاس سے باہر) بلکہ سب کچھ تھے اور مجھ سے پہلی ملاقات کے بعد سے انگریزی میں اوّل بدرجہ اوّل ایم اے کر کے اسی زبان میں آکسفورڈ سے آنرز کی ڈگری لینے کے لیے ولایت جانے تک انھوں نے انگریزی اور اردو ادبیات میں میرا مذاق استوار کرنے میں میری غیر رسمی رہنمائی کی۔ ساتھ ہی ان کے بعض چوٹی کے علم دوست احباب مثل خواجہ غلام السیدین[1] اور مختار حامد علی[2] سے ملاقات کے مواقع نصیب ہوئے

---

[1] سیدین صاحب، خواجہ منظور سے ایک سال سینیر تھے۔ ان پر میرا مضمون

(باقی اگلے صفحہ پر)

جو منظور صاحب کے ساتھ بیٹھتے تھے اور جن سے بھی میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ مگر اس کے لیے مجھے کتنے "اور کیسے پاپڑ بیلنے پڑے"، یہ ایک لمبی داستان ہے جسے میرا ہی دل جانتا ہے۔ وہ طلبا کے ماہ نامہ علی گڑھ میگزین (اردو) کے ایڈیٹر بھی تھے اور میرے اس رسالے کا مضمون نگار بننے کے شوق نے بھی مجھے اُن کا قرب حاصل کرنے میں مدد دی۔

حافظ کا شعر ہے ؎

آں را کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند

میں نے اسے اردو میں ڈھالنے کی کوشش تو کیا کی ہے منہ چڑھایا ہے ؎

جو خاک کو نگاہ سے کرتے ہیں کیمیا

اے کاش ہم پہ بھی وہ کبھی اک نظر کریں

واقعہ یہ ہے کہ حافظ کا یہ لاجواب شعر خواجہ منظور صاحب کی ذات پر پورا پورا صادق آتا ہے۔ یہ انھیں کا کرشمہ تھا کہ میں ایک معمولی جونیر طالب علم ہوتے ہوتے جب اُن کی نظروں میں چڑھ گیا تو انھوں نے مجھے آہستہ آہستہ آسکر وائلڈ، اسٹیونسن، ہیزلٹ، چارلس لیمب، مڈلٹن مرے (انگریزی) ٹالسٹائے، چیخوف، ترگنیف (روسی) موپاساں، بالزاک، اسٹینڈل (فرانسیسی) میٹرلنک (بلجین) وغیرہ جیسے مصنّفوں سے آشنا کرایا اور چونکہ اُن دنوں وہ خود اِن میں سے بعض کے اردو ترجمے کر رہے تھے مجھے بھی اپنی راہ پر لے آئے۔ یہ تو ہوا حافظ کے شعر کے پہلے مصرع پر اُن کا پورا اُترنا، دوسرے مصرعے کے سلسلے میں اُن کی دیرآشنائی کی داستان ملاحظہ ہو۔

دراصل مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ رشید صاحب کے طالب علمی کے زمانے سے نکل کر یونیورسٹی میں اُستاد بن جانے کے بعد اُن کی جگہ علی گڑھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

میرے مجموعہ "چند اکابر، چند معاصر" میں شامل ہے۔

۲؎ ان صاحب کا مختصر تذکرہ منظور صاحب کے ساتھ میری "حیات مستعار" حصہ دوم میں آیا ہے۔

میگزین کا اڈیٹر کون طالب علم ہوا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ خواجہ منظور ہیں اور اُن کے نکالے ہوئے دو ایک پرچے دیکھے نیز انھیں رشید صاحب کے زمانے کے پرچوں سے بہتر پایا تو اُن سے متعارف ہونے کے لیے دل بے قرار ہوا۔ بھائی حبیب[1] سے ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ وہ "ہم میں سے نہیں ہیں" یعنی "کھلنڈروں" میں سے نہیں ہیں، اس لیے اُن کی ان سے ملاقات نہیں۔ مزید معلوم ہوا کہ وہاں تو فرشتوں کے پر جلتے ہیں اُن کا ایک بالکل الگ گروپ ہے جس پر حالی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار

کس طرح اس شوخ سے پیدا تعارف کیجیے!

وہ بکی بارک کے کمرہ نمبر ۷۰ میں رہتے ہیں جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچھے اچھے طلبہ کا زہرہ آب ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے چوٹی کے علمی و ادبی ذوق رکھنے والے بیشتر طالب علموں کے اس کمرے میں رہنے کی ایک روایت قائم ہو چکی ہے۔ نیز وہاں پروفیسر ڈکنسن، پروفیسر ہل اور رشید صدیقی جیسے اساتذہ جا کر بیٹھتے اور اُن کے ساتھ چائے پیتے اور پلاؤ اور کباب کھانے کی فرمائش کرتے ہیں۔

مجھ پر یہ سب کچھ سننے کے بعد بہت ہی رعب پڑا مگر میرا اُن سے شوقِ ملاقات کم نہ ہوا۔ حبیب بھائی کے کہنے سے اُن کے ایک دوست سلطان محمود صاحب (بعد میں اٹاوہ کے نامور وکیل ہوئے، اب خدا کے جوارِ رحمت میں ہیں) جو بکی بارک کے کمرہ نمبر ۶۲ میں رہتے تھے اور منظور صاحب کے سیکشن میں اُن کے ہم جماعت تھے مجھے اُن سے ملانے کے لیے تیار ہو گئے مگر اُن کا حال یہ تھا کہ جب وہ خواجہ صاحب کے پاس مجھے لے گئے تو سہمے سہمے سے تھے اور رسمی تعارف کرانے کے بعد جتنی دیر ہم اُن کے کمرے میں بیٹھے، اُنھوں نے اُن سے کوئی بات نہ کی۔ چپ بیٹھے بس ہماری باتیں سنتے رہے۔ مجھے کہنا چاہیے کہ میری باتیں سنتے رہے کیونکہ بڑی ہمت

---

[1] حبیب احمد صدیقی، میرے ایک ننہالی عزیز جو یونیورسٹی میں فٹ بال کے کپتان تھے اور جن کے مشورے سے اعلیٰ تعلیم کے لیے میں علی گڑھ بھیجا گیا تھا۔

کر کے یوں ہی باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا، دوسری طرف سے پذیرائی نہیں ہو رہی تھی۔

خواجہ صاحب کی شخصیت نہایت حسین، نستعلیق، متین اور بردبار تھی۔ وہ قدرے دُہرے بدن کے تھے۔ اُن کا چہرہ گول اور ہلکے زرد رنگ کے گلاب کا سا تھا۔ سر پر لانبے دمگر نئے ترشے ہوئے) سیاہ، چمکیلے اور نرم نرم بال تھے۔ جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے بار بار پیچھے کی طرف لے جاتے تھے۔ وہ ایک خاص دضع سے بیٹھے تھے۔ اُن کی بڑی بڑی خوش رنگ اور آب دار آنکھیں، دو کٹوریوں کی طرح تھیں جو باتیں کرتی تھیں مگر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے اغماض کرتی تھیں[1] اور اگر مل بھی جاتیں تو بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتی تھیں، اگرچہ بد اخلاقی کا پھر بھی گمان نہ ہوتا تھا۔ اسے شرم وحیا بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ اُن کی دیر آشنا فطرت کا ایک نادر مظاہرہ تھا جو مجھے کسی اور دیر آشنا شخصیت میں بھی کبھی نظر نہیں آیا۔ وہ ایک "مستثنیٰ" شخصیت کے مالک تھے۔ میں اُن کی صحیح صحیح تصویر کیسے پیش کروں۔ میرؔ کا مشہور شعر یاد آرہا ہے مگر پوری طرح اُن کا نقشہ نہیں بیان کرپاتا ہے

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا، شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

جگرؔ نے جن سے کچھ ہی عرصہ پہلے میرے تعلقات قائم ہو چکے تھے اور بعد میں جب خواجہ صاحب سے بھی میرے خاصے مراسم ہو گئے تھے اور جگرؔ کے علی گڑھ آنے پر میں اُنھیں خواجہ صاحب کے پاس لے جاتا تھا۔ اپنی ایک فارسی غزل میں اُن کے لیے ایک شعر کہا تھا جو میرؔ کے شعر کے مقابلے میں یہاں پیش کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے

---

[1] یاسؔ عظیم آبادی کا شعر یاد آگیا ہے

دیوانہ وار دیکھ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے!

من عاشق آں شوخم کو از سر محبوبی
مانوس دلے دارد بیگانہ نظر دارد[1]

غرض کہ وہ اس پہلی ملاقات میں اپنے کو بہت لیے دیے رہے اور ان سے بے تکلف ہونا بے حد مشکل معلوم ہوا۔

میں نے کہا ہے کہ وہ انگریزی کے لائق طلبہ میں شمار ہوتے تھے مگر جیسا کہ آیندہ صحبتوں میں پتا چلا، گو وہ عاقل خاں کے رہنے والے تھے، لہٰذا دلی کی شستہ، رفتہ، بامحاورہ اور ٹکسالی اُردو بولنے پر قادر بلکہ مصر تھے۔ کیا مجال کہ اُردو میں بات کرتے ہوئے انگریزی کا کوئی معروف لفظ بھی آجائے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا مگر ان کی اُردو میں بلا کی شگفتگی تھی۔ اس کا اندازہ نشست کے آخر میں ہوا جب وہ ذرا ٹھہر ٹھہر کے، اٹک اٹک کے اور دیر دیر سے کچھ ہوں ہاں کرنے لگے۔ مگر اس مختصر سی گفتگو میں جو موضوعات انھوں نے چھیڑے یا جن کی طرف اشارے کیے، مجھے اپنے شعور سے بالا معلوم ہوئے اور سلطان محمود صاحب کے تو کیا خود میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ میں نے بڑی ہمت کر کے اپنی مضمون نگاری کے شوق کا ذکر کیا مگر میگزین کے لیے کچھ پیش کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی اگرچہ دل اس میں کچھ چھپوانے کے لیے بری طرح مچل رہا تھا۔[2] خیر

---

[1] جگر نے مجھ سے بتایا تھا کہ یہ شعر انھوں نے خواجہ منظور صاحب کے لیے کہا تھا۔ ان دنوں وہ بدایوں سے علی گڑھ آئے تھے اور زیادہ تر وقت میرے ہاں گزارا تھا۔ بدایوں ہی میں یہ فارسی غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے ؎

گویند کہ ہم زاہد در دیدہ بصر دارد
وار دبصرے اما تعیین نظر دارد

سچ پوچھیے تو اس میں غزل کا شعر اٹھارہ میں سے ایک ہی منظور والا تھا۔ جگر صاحب نے منظور کو غزل سنائی تھی مگر ہم میں سے کسی نے اس شعر کی ماہیت سے انھیں آگاہ نہیں کیا تھا۔

[2] جگر نے اصغر صاحب کے لیے یہ جو شعر لکھا ہے نام بدل دینے کے
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چلتے وقت خواجہ صاحب کا دل کچھ پسیجا اور ازراہ ہمت افزائی انھوں نے فرمایا کہ میرا مضمون میگزین کے معیار پر پورا اترا تو ضرور شائع ہوگا۔
علی گڑھ میگزین کا مستقل مضمون نگار تو میں نہ بن سکا مگر خواجہ صاحب کی توجہ اور میرے شوق نے مجھے میگزین کا مضمون نگار بننے سے بالکل محروم نہیں رکھا اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ میں نے بحیثیت نائب مدیر ۱۹۲۵ء میں اس رسالے کا علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر خاص نمبر شائع کیا۔ سیّدین صاحب اس وقت ایم ایڈ کی ڈگری لینے لیڈز اور خواجہ منظور آنرز کے لیے آکسفورڈ جا چکے تھے۔ میں بی اے کے آخری سال میں تھا۔
میں نے پچھلی سطور میں کہا ہے کہ خواجہ منظور نے علی گڑھ میگزین کا معیار رشید صاحب کے زمانے کے معیار سے بھی زیادہ بلند کر دیا تھا۔ یہ شعور اور ذوق کا معاملہ ہے۔ شاید کوئی کہے کہ میں نے بہت بڑی بات کہہ دی تو میں دو جملوں میں اس معاملے کو صاف کیے دیتا ہوں۔ رشید صاحب کے زمانے کے جو پرچے مجھے پڑھنے کو مل سکے ان میں جانِ غزل تو خود موصوف کے مضامین ہوتے تھے اور باہر کے لکھنے والوں میں عموماً فانی، اصغر، جگر اور سجاد انصاری جیسے چوٹی کے شعرا اور اہل قلم تھے۔ منظور صاحب نے ان اصحاب کے علاوہ آغا حیدر حسن دہلوی، نیاز، جوش،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)
بعد منظور صاحب کی شخصیت اور علمیت کے پیش نظر میرے اور ان کے تعلقات کی نوعیت پر بھی صادق آتا ہے۔ اگرچہ وہ بعد میں مجھ سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے مگر میری ہمت ان سے ایک حد سے آگے جانے کی کبھی نہیں ہوئی ؎

حریم حسنِ معنیٰ ہے جگر، کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو با ادب ہو کر، تو اٹھو باخبر ہو کر

ے بعد میں حیدرآباد دکن چلے گئے تھے۔ قلعۂ معلیٰ کی بیگماتی زبان لکھتے تھے جسے شاید نثر کی ریختی کہہ سکتے ہیں۔ محفلوں میں زنانے کپڑے پہن کر
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عظمت اللہ خاں وغیرہ کو بھی کھینچ بلایا اور تنقیدی تحقیقی اور سائنسی مقالات کی شمولیت بھی ضروری سمجھی۔ مثلاً ولی پر مولانا احسن کی ضخیم اور اہم تصنیف کے بعض حصے جسے کامل طور پر بعد میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا اور پروفیسر عبدالمجید قریشی کے آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) پر اردو میں مسلسل مقالات پہلے پہل منظور کی ادارت کے زمانے میں علی گڑھ میگزین ہی میں چھپے۔ چنانچہ طلبہ کے رسالے کے بجائے میگزین سارے ملک کا بہترین ادبی و علمی جریدہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔

میں نے علی گڑھ میں بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد چند سال دفتر رجسٹرار میں ملازم رہا پھر اردو میں ایم اے کرنے الٰہ آباد یونیورسٹی چلا گیا۔ علی گڑھ کے میرے چار سال کی باقاعدہ طالب علمی کے زمانے میں مختلف اوقات اور جماعتوں میں پروفیسر غلام سرور، پروفیسر انعام اللہ خاں پروفیسر جے اے ہل اور پروفیسر ای سی ڈکنسن انگریزی میں میرے استاد رہے۔ جنھوں نے مجھے شیکسپیر، ملٹن تھیکرے، مکالے، ورڈز ورتھ، شیلے، بائیرن، کیٹس، ٹینیسن وغیرہ اور ہارڈی، برنارڈ شا، رابرٹ بروکس، جان میتسفیلڈ سبقاً سبقاً پڑھائے جو نصاب میں شامل تھے۔ مگر غیر نصابی انگریزی اور غیر انگریزی مصنفین سے مجھے خواجہ صاحب ہی نے متعارف کرایا۔

چیخوف کے افسانے میں نے انھیں کی ترغیب سے ترجمہ کیے شروع میں یہ مجھے پسند نہیں آئے۔ تحلیل نفسی سے خصوصاً فرانسیسی مصنفین کے قصوں میں درد سر ہونے لگتا۔ اس وقت تک میں نے سجاد حیدر، سلطان حیدر، جوشؔ، نیاز فتح پوری وغیرہ کے افسانے یا عبدالحلیم شررؔ اور حکیم محمد علی خاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

بیگماتی انداز و اشارات سے بولتے تھے۔ "میگزین فنڈ" کے پس انداز سے بیسوں سے خواجہ صاحب نے آغا صاحب کے مضامین "پس پردہ" کے نام سے کتابی شکل میں چھاپے تھے۔ "باقیات فانی" اور "محشر خیال" (سجاد انصاری مرحوم کا مجموعہ) یہ دونوں بھی شائع کرانا چاہتے تھے مگر بوجوہ نہ کر سکے۔ "باقیات" کی تسوید راقم نے کی تھی۔

وغیرہ کے ناول پڑھے تھے۔ ان میں عموماً حسن و عشق، جنسیت اور رومانیت کا رنگ غالب تھا۔ پریم بتیسی[۳۲] یا پریم پچیسی[۲۵] میں پریم چند نے دیہاتی زندگی کے مرقعے کھینچے تھے۔ مگر چیخوف نے جو عام زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات و معاملات کی تصویریں کھینچی تھیں اور جذبات و نفسیات کی تصویر کشی یا دل اور روح کے جوروں کی گرفت کی تھی وہ بالکل نئی چیزیں تھیں جن سے اردو دنیا نا واقف تھی اور جنھیں میں آہستہ آہستہ سمجھا۔ یہ مجھے اس سے معلوم ہوا کہ افسانے کے لیے کوئی پلاٹ تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زندگی میں قدم قدم پر افسانے بکھرے پڑے ہوتے ہیں، دیکھنے والی آنکھ ہونی چاہیے اور قلم جو انھیں اپنی گرفت میں لے لے۔ اس نے اپنی کہانیوں کو "زندگی کی قاشیں" (SLICES OF LIFE) کہا ہے۔ میں انھیں پرشور سمندر کی لہریں (WAVES OF TEMPESTOUS SEA) کہوں گا۔

اردو مختصر افسانے میں "اصلیت" "واقعیت" اور "رومانیت سے دستبرداری اور بغاوت" کا دور چیخوف کے ترجموں سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے ایک ایک ترجمہ ترگنیف اور موپاساں کا بھی کیا اور ان مصنفین کے انداز پر کچھ اوریجنل افسانے بھی لکھے اور مختلف رسائل میں چھپوائے۔ یہ دو جلدوں میں "سیر گل" اور "اصنام خیالی" کے نام سے بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے چیخوف کا ایک ڈراما انکل وانیا (UNCLE VANYA) "ماموں جان" کے نام سے "جامعہ" دہلی میں بالاقساط شائع ہوا۔ یہ اور کچھ اور ترجمے اور اوریجنل افسانے جو مختلف رسائل میں چھپے، ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ اصل میں ایم اے اردو کا طالب علم اور بعد میں استاد مقرر ہونے پر افسانے سے دل چسپی ختم ہو گئی۔ میں نے ایک ڈراما میٹرلنک کا "مونا دانا" اس کے اسی نام سے ترجمہ کیا جو پہلے بالاقساط "مخزن" لاہور میں چھپا پھر کتابی شکل میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اسے میں نے خواجہ صاحب کو ڈیڈیکیٹ کیا تھا۔ اس وقت ان کا اردو میں کام کرنے کا شوق کچھ مدہم سا ہو چلا تھا۔ میں نے انتساب میں ان سے اپنے پرانے شوق کو بدستور برقرار رکھنے کی درخواست

کی تھی۔[۱]

طالب علمی کے زمانے میں اُنھوں نے علی گڑھ میں کئی روسی افسانے ترجمے کیے اور "علی گڑھ میگزین" میں چھپوائے تھے۔ مجھے ترگنیف کا ایک طولانی افسانہ "آسیا" یاد ہے جو اُنھوں نے ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے کا اُن کا ایک خاص انداز تھا اور جہاں تک ممکن ہوتا وہ ترجمے میں اصل کے اندازِ بیان کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ کہتے تھے اپنی زبان میں نئے اسلوب لانا بھی زبان کی خدمت ہے۔ اس لیے ترجمہ کہیں کہیں اُکھڑا اُکھڑا اور نامانوس سا معلوم ہوتا تھا مگر بہ حیثیت مجموعی معیاری ہوتا کیونکہ آخر دلی کے تھے۔ وہ اپنی عبارت میں اوقاف کے علامات استعمال کرنے کے بھی قائل تھے اور اگرچہ ہمارے ہاں اس کا باقاعدہ التزام نہ تھا مگر وہ جہاں تک ممکن تھا انگریزی کے انداز پر اوقاف لگاتے تھے۔ اُن کا انگریزی اور اُردو کا خط بہت پاکیزہ تھا۔

ایک مرتبہ ترجمے میں ایک جگہ ایک شعر آگیا، کچھ اس طرح کی سطریں تھیں:-

ART THOU ASLEEP?
WITH GUITAR SHALL I AWAKEN THEE?

خواجہ منظور نے کہا اس کا ترجمہ شعر میں کر دو۔ میں نے کوشش کی اور اُنھیں

---

[۱] عرصۂ دراز کے بعد جب میں نے پاکستان میں راس مسعود سوسائٹی قایم کی اور بہت سی منتخب اُردو نظموں کے انگریزی منظوم ترجمے جو راس مسعود صاحب نے کیے تھے انھیں REALMS OF GOLD کے نام سے کتابی شکل میں نکالا تو اس کا انتساب بھی خواجہ منظور حسین کے نام کیا۔ افسوس اس وقت وہ مرحوم ہو چکے تھے۔ مجھے اس امر کا انتہائی صدمہ ہے کہ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد القاقات زمانہ مجھ سے اور خواجہ صاحب سے وہ قریبی روابط قائم نہ رہ سکے جو رہنے چاہیے تھے۔ متذکرہ کتاب میں نے خواجہ شاہد حسین صاحب کو ارسال کی تھی مگر مجھے اس کی رسید نہیں ملی۔ ایک خط میں نے اُن کو بعد میں لکھا۔ اس کا بھی جواب نہ آیا۔

یہ شعر لکھ کر دے دیا ہے

آنکھیں ہیں بند تیری جو افسونِ خواب سے
تجھ کو جگاؤں نغمۂ تارِ رباب سے

بعد میں غزل ہو ہی۔ چند اور شعر سنانے کو جی چاہتا ہے ؎

سرمایۂ حیات ہے میرے لیے وہ نور
چھَن کر نکل رہا ہے جو بندِ نقاب سے
برہم ہو نظمِ ہر دو جہاں، ہو جو سامنے
کونین کو قرار ہے تیرے حجاب سے
اُس حسنِ لازوال سے مجھ بے کمال کو
نسبت ہے وہ جو ذرہ کو ہے آفتاب سے
اُس میں یہ حسن و رنگ وطراوت بھلا کہاں
تشبیہ لب کو دیتے ہیں برگِ گلاب سے!

خواجہ منظور سے مجھے ایک اور شوقِ فراواں ملا اگرچہ میرے دل میں کسی حد تک اس کی ابتدا کچھ دن پہلے سے ہو چکی تھی۔ وہ مختلف شعرا کے اپنے پسندیدہ اشعار اور نظمیں بھی وقتاً فوقتاً اپنی بیاضوں میں نقل کرتے رہتے تھے۔ دورِ حاضر کے شعرا ہوں یا اساتذۂ قدیم اس کی کوئی قید نہ تھی اور جب موڈ میں ہوتے تو اپنے کمرے میں خاصی بلند آواز سے انھیں ایک خاص انداز میں پڑھتے۔ کہتے تھے ان بیاضوں کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب چاہا ان سے جی خوش کر لیا۔ حوالے کی کتابوں یا پورے پورے دواوین کی ضرورت نہیں، لمبے سفر یا طولانی قیام کے دوران اپنے ساتھ انھیں بیاضوں کا ہونا کافی ہے۔ میں نے اُس وقت سے اب تک اس قسم کی تین خاصی ضخیم بیاضیں اپنے لیے تیار کیں جن کا کہیں کہیں ذکر بھی کرتا رہا ہوں اور ان سے نہ صرف اپنے مضامین میں فائدہ اٹھایا ہے بلکہ خاص مضامین بھی تیار کیے۔

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنو عامر میں!

جوشؔ صاحب[1]

میں پرانا ہوں ترا دیکھنے والا اے دوست
وہ بھی جلوے مری آنکھوں میں ہیں جب طور نہ تھا!

(ریاضؔ خیرآبادی)

غالباً ۱۹۵۷ء کا واقعہ ہے۔ میں دفتر میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ میرے چپراسی نے کہا "جوشؔ صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا"۔ ساتھ ہی میری میز پر رکھے ہوئے کاغذات کی تہ سے ایک پرچہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "آپ انھیں اس نمبر پہ فون کرلیں۔"

"جوشؔ صاحب کا فون"؟ میں نے تعجب سے کہا "میرے لیے؟ نہیں نہیں جعفری[2] صاحب کے لیے ہوگا۔"

"جی۔ انھوں نے بار بار آپ کا نام لیا"۔ چپراسی نے جواب دیا۔ "اور جب میں نے بتایا کہ آپ ابھی نہیں آئے ہیں تو مجھے اپنا نمبر لکھا کر کہا کہ جب آئیں تو ان سے کہنا "جوشؔ صاحب کو فون کرلیں"۔

"اچھا؟" میں نے کہا مگر یقین ہی نہ آتا تھا کہ جوشؔ صاحب نے مجھے فون کیا ہوگا۔ یہ احساس بے سبب نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی چوڑی داستان تھی۔

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے جوشؔ صاحب سے میری نیازمندی

---

[1] اگرچہ گزٹ آف پاکستان مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۵۸ء میں آپ کے نام کے ساتھ لفظ "علامہ" شامل کیا گیا ہے مگر ذاتی طور پر یہ مجھے کچھ انمل بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو جوشؔ صاحب کو جوشؔ صاحب ہی کہنا مرغوب ہے۔

[2] معروف مزاحیہ شاعر سید محمد جعفری مرحوم۔ ان دنوں ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔

۲۲-۱۹۲۰ء میں شروع ہو گئی تھی۔ اُس وقت میں اپنے سابق وطن اُناؤ کے سرکاری ہائی اسکول میں نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اور جوش صاحب کا پہلا مجموعہ "روحِ ادب" [1] نیا نیا چھپا تھا۔ بہت جلد اس کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ اور اس کی ایک جلد میرے ہاتھ بھی آ گئی۔ بہ حیثیت مجموعی اُردو کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا تھا اور اس مجموعہ کی نظموں

---

[1] اس ایڈیشن کی بعض خصوصیات بہت دل چسپ تھیں۔ پیڈرو (PEDRO) یا ریڈلیمپ (RED LAMP) نام کی سگرٹیں اس زمانے میں مشہور عام تھیں جیسے آج کل کے ٹو (K-2) سگرٹ ہے۔ ان کی ڈبیوں میں چھوٹی چھوٹی سستی رنگین تصویریں سگریٹ کو مقبول بنانے کے لیے رکھی ہوتی تھیں جیسی آج کل فلمی ستاروں کی ہوتی ہیں۔ جوش صاحب کے مجموعہ میں اس قسم کی تصویریں شامل تھیں جن کے نیچے ایسے اشعار درج ہوتے تھے ؎

جبیں پر سادگی، نیچی نگاہیں، بات میں نرمی
مخاطب کون کر سکتا ہے تم کو لفظ قاتل سے

رنگیں رخوں نے ذبح کیا دل کو ریل پر
مرنے کو اور جایئے پنجاب میل پر

اس مجموعہ میں جوش صاحب کی نثر میں شاعری کے کچھ نمونے بھی شامل تھے یعنی سستی، تخیلاتی، تصوراتی نثر کا وہ انداز جو ٹیگور کے گیتوں کے مجموعہ "گیتان جلی" کے اُردو ترجمہ کے بعد سے، جو نیاز فتحپوری صاحب نے شائع کیا تھا اس زمانے میں اردو ادب پر دس بارہ برس تک چھایا رہا۔ اسے نیلورییٹ کہا جاتا تھا۔ بنگالی زبان میں ایسی عبارتوں کے کچھ معنی ہوں گے مگر اُردو میں ذرا غیر سنجیدہ اور مضحکہ خیز ہی معلوم ہوتی تھیں مثلاً ایک آئس کریم بیچنے والی لڑکی کی حکایت تھی کہ وہ دکان پر موجود ہوتی تو آئس کریم بے حد شیریں ورنہ بالکل پھیکی معلوم ہوتی۔ پاکستان بننے کے بعد سابق کتب خانہ تاج آفس بندر روڈ کراچی میں "روح ادب" کا ایک بمبئی میں چھپا ہوا نسخہ نظر سے گزرا اس میں سے یہ "مطائبات" نکال دیئے گئے تھے۔

اور غزلوں کے لہجہ میں واقعتاً کچھ ایسا نیا پن تھا جس نے اس زمانے کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرے ابھرتے ہوئے مذاق شعر کو بھی غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ یہ یاد نہیں کہ اس ایڈیشن میں جوش صاحب کی تصویر شامل تھی یا نہیں لیکن یہ خوب یاد ہے کہ انھیں دنوں میں نے ملیح آباد میں جہاں میری نانہال تھی اور میں گرمیوں کی تعطیلات میں اپنے نانا میاں کے باغات کے آم کھانے جایا کرتا تھا، آموں کے کارخانوں کی کسی فہرست میں جوش صاحب اور ان کے بھائی (غالباً بشیر احمد خاں صاحب ؟) کا ایک گروپ فوٹو چھپا ہوا دیکھا تھا۔ ان سے ملنے کی بھی خواہش پیدا ہوئی تھی مگر کیا پِدّی اور کیا پِدّی کا شوربہ، میری حیثیت آج کیا ہے جو اس وقت ہوتی۔ میری خواہش پوری نہ ہوسکی اور بڑی مایوسی ہوئی۔

۱۹۲۲ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ چلا گیا۔ خوش قسمتی سے جلد ہی مجھے وہاں کے اسٹاف اور طلبا کے اعلیٰ علمی و ادبی حلقوں میں بار مل گیا۔ خواجہ منظور حسین[1]، متعلم بی اے جو رشید صدیقی صاحب کے ایم اے پاس کرنے اور یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر مقرر ہونے کے بعد مجلہ "علی گڑھ میگزین" کے نئے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے اور مجھ پر بہت مہربان تھے اور جوش صاحب کے معتقدوں میں پیش پیش تھے۔ وہ ان کا کلام "میگزین"[2] میں اپنے ادارتی نوٹوں کے ساتھ بڑی آب و تاب سے شائع کرتے تھے۔ منظور

---

[1] اب مرحوم ہوگئے۔ آکسفورڈ سے انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کی تکمیل کے بعد علی گڑھ، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد رہے اور اسی کالج کے پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں پاکستان انٹر یونیورسٹی بورڈ کے معتمد رہے۔ انگریزی اور اردو کے چوٹی کے عالم اور نقاد تھے۔ اب ایسے لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ میرے ان کے تعلقات تادیر قائم رہے اور مرحوم سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ ان پر اس مجموعہ میں مضمون شامل ہے۔

[2] یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دو ہی ایک سال پہلے اسی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صاحب کی صحبت میں جوش صاحب سے میری عقیدت اور بڑھی۔ جب انھوں نے اپنی ادارت میں "میگزین" میں اپنے والہانہ ادارتی نوٹ کے ساتھ جوش صاحب کی ایک شان دار عاشقانہ نظم دیا مسلسل غزل) جس کا عنوان غالباً "صحبتِ شب" تھا شائع کی اور جس کے بعض اشعار

(بقیہ حاشیہ صفحۂ ماسبق)

"میگزین" میں رشید صاحب کے دورِ ادارت میں "روح ادب" پر اردو کے مشہور صاحبِ طرز ادیب و نقاد سجاد انصاری کا ایک بے پناہ خط چھپا تھا جس میں جوش صاحب کی شاعری اور ان کے اس مجموعہ پر حضرت اکبر الہ آبادی کے دیباچہ نیز مولوی (بعد میں مولانا) عبدالماجد (دریا بادی) کی تنقید پر جو "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوئی تھی بڑی سختی سے لے دے کی گئی تھی۔ یہ خط سجاد انصاری کے مجموعۂ مضامین "محشرِ خیال" میں شامل ہے۔ میں نے اسے "میگزین" میں چھپا ہوا اس رسالے کے ایک فائل میں علی گڑھ آنے کے بعد دیکھا۔ اس خط کے بعض حصے یادگار حیثیت رکھتے ہیں مثلاً :-

"عبدالماجد صاحب تحریر فرماتے ہیں "آغاز کتاب میں چند دیباچے شامل کیے گئے ہیں اور نوجوان مصنف کے فخر و امتیاز کے لیے یہ امر کافی ہے کہ ان میں سے ایک دیباچہ حضرت اکبرؔ کے قلم کا ہے جو شاید مصنف کے نام کوئی خط تھا۔ دوسرے الفاظ میں حسنِ عقیدت کا تقاضا یہ ہے کہ جوش کو بلند پایہ شاعر مان لیا جائے صرف اس لیے کہ حضرت اکبرؔ ان کی مدح سرائی میں مبتلا ہو گئے۔ اگر کسی بدصورت کو کوئی حسین عورت خوبصورت کہہ دے، عبدالماجد صاحب کی اس منطق کا اصرار ہو گا کہ اسے خوبصورت مان لینا چاہیئے"۔

'روح ادب' کی اشاعت کے بعد میں نے حضرت اکبر مرحوم کو ایک خط لکھا تھا۔۔۔۔ اس کا جواب عجیب رنگ میں آیا۔ ضروری اقتباس یہ ہے : 'خدا جانے کیا دیکھا، کیا سمجھا، کیا لکھ گیا ؎

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حافظؒ کے مدد سے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں تو میری آنکھوں کے سامنے کائنات رقص کرنے لگی اور قلب و دماغ رنگ و لنور سے جگمگا اٹھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ شاعر نے بقول افادی الاقتصادی ایم مہدی حسن "میری جوانی کے قصے" نظم کر ڈالے ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ما سبق)

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

رنگِ تصوف مجھے پسند ہے۔ وہ کوشش بہتری کی کرتے ہیں ؎

شیخ کی منطق ہو یا چشمِ فسوں ساز بتاں
سیدھا سادھا ہوں مجھے گمراہ جو چاہے کرے

وہ میرے عنایت فرما ہیں۔ میں ان کا خیر طلب ہوں۔ خاموش رہیئے۔ اللہ اللہ کیجیئے۔ خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے!"

" مجھ میں اس قدر صبر و تحمل نہیں کہ حافظ، عمر خیام اور غالب کے ایسے پیغمبرانِ سخن کے مقابلہ میں جوش کی پیمبری کا ذکر سنوں اور اس کے خلاف نہایت شائستہ خیالی کے ساتھ منطقی دلائل پیش کروں۔ ۔ ۔ عمر خیام کے پیام بے ثباتی کو جوش کے پیام سے وہی نسبت ہے جو فرشتوں کی حمد و تسبیح کو ایک گنہ گار انسان کی ہرزہ سرائیوں سے۔ ۔ ۔ ۔"

" دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ بندشوں کی دل آویزیوں سے محروم، طرزِ ادا کی جدتوں سے بے بہرہ ایک خشک، غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ عمر خیام اور جوش کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے۔ اگر اسی پیام کی تبلیغ معیارِ شاعری قرار دی جائے تو "زہرِ عشق" کا مصنف بھی ایک الہامی شاعر تھا ۔ ۔ ۔ ۔"

؎ یہ نظم اب جوش صاحب کے مجموعۂ شاعر کی راتیں" میں شامل ہے جو پیشِ نظر نہیں۔

شب کہ حریم ناز میں شورِ صد اضطراب تھا
عشق بھی تھا برہنہ سر، حسن بھی بے نقاب تھا
آنکھوں میں روئے یار تھا، آنکھیں تھیں روئے یار پر
ذرہ تھا آفتاب میں، ذرہ میں آفتاب تھا
موجِ ہوا میں عطر تھا، چٹکی ہوئی تھی چاندنی
پھول کھلے تھے باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا
ہونٹوں کو وقتِ گفتگو چومتی تھی شگفتگی
بات جو تھی سو پھول تھی، پھول جو تھا گلاب تھا
عشق کا سر جھکا ہوا سر سے کفن بندھا ہوا
خنجرِ ناز بے نیام، تیغ بہ کفِ شباب تھا
عشق کے خونِ گرم میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں
حسن کے دستِ ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا
میں نے جو کچھ کنایتاً تجھ سے کہا اسی طرح
بزمِ جہاں میں ایک دن جوشؔ بھی کامیاب تھا!

جیسا کہ میں نے کسی اور مضمون میں لکھا ہے۔ جوشؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات شاہ دلگیر اکبرآبادی[۱] نے ۱۹۲۵ء میں میری مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر کرائی تھی جب دونوں حضرات اس کے کل ہند مشاعرے کے سلسلے میں وہاں آئے ہوئے تھے۔ شاہ صاحب اور میں ایک صبح میرے کمرے سے جوبلی کے پنڈال کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں جوشؔ صاحب اپنے چند احباب کے ہمراہ مل گئے۔ شاہ صاحب نے اُن سے میرا تعارف اس شعر کے مصنف کی حیثیت سے کرایا ؎

طے کر رہا ہوں عشق کی اُن منزلوں کو میں
مری خبر ہے اُن کو نہ اُن کی خبر مجھے!

تو جوشؔ صاحب نے بڑے وقار کے ساتھ جو مجھے اندازہ ہوا ان کا ایک خاص وصف تھا کہا "یہ شعر ایک خاص مقام پہ پہنچ کر لکھا گیا ہے"۔

---

[۱] الناپر میرا مضمون اسی مجموعہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

اس کے بعد اسی موقع پر یا جلد ہی کسی اور سلسلے میں ایک رات رشید صدیقی صاحب کے ہاں ان کی نشست ہوئی۔ ایک خاص وقار جس سے دیکھنے والے پر شاعر کے علاوہ ایک انسان کی حیثیت سے اُن کی شخصیت کا بڑا اثر پڑتا تھا یہاں بھی نظر آیا۔ نشست کے خاتمہ پر میں نے بلا واسطہ اپنا مزید تعارف کرایا۔ ملیح آباد سے میرا تعلق معلوم کر کے بہت خوش ہوئے اور جب میں نے اپنے ماموں عرشؔ[1] مرحوم کا تذکرہ کیا تو تڑپ اُٹھے اور بے اختیار کہا "ہائے وہ جواناں مرگ!" کچھ دیر بعد میری والدہ صاحبہ کو پوچھا "اور ہماری شہزادی باجی کہاں ہیں؟ ہم سب بچپن میں ساتھ کھیلے ہیں۔" غرض کہ دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

اتفاقات زمانہ کے ہاتھوں تقسیم ملک سے پہلے ہم دونوں یعنی میں اور جوشؔ صاحب پھر یکجا نہ ہو سکے، اگرچہ ایک دوسرے سے بالکل بے خبر بھی نہیں رہے۔ کم از کم ایک بار تو یقیناً جوشؔ صاحب کو میری یاد دلائی گئی جب انھوں نے اپنے ایک مجموعہ کا نام "نقش و نگار" رکھا اور جامعہ بک ڈپو دہلی کو اشاعت کے لیے دیا۔ یہ نام میری نظموں اور غزلوں کے مجموعے کا تھا جو جوشؔ صاحب کے "متذکرہ مجموعہ سے پہلے شائع ہو چکا تھا مگر محبی ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کے احتجاج کے بعد بھی انھوں نے اپنے مجموعے کا نام نہیں بدلا۔ پاکستان بننے کے بعد جوشؔ صاحب ہندوستانی شہری کی حیثیت

---

[1] سید محمد علی عرشؔ ملیح آبادی مرحوم، مقام منانور، تعلقہ امرآباد، حیدرآباد دکن میں جیلر تھے۔ غالباً ۱۹۱۹ء میں ملازمت سے رخصت لے کر وطن آئے تھے کہ بعارضہ دق انتقال کیا۔ تیس ۳۰ بتیس ۳۲ سال کے درمیانی عمر تھی۔ اُن کا کچھ کلام میں نے علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے دوران رسالہ "ہزار داستان" لاہور میں شائع کرایا تھا۔ اس وقت اس رسالے کے مدیر سید احمد مجددی سہا تھے۔ ابوالاثر حفیظ کے پاس ماموں جان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کے ایک مجموعہ کا قلمی نسخہ تھا جن میں سے چند انھوں نے اپنے دور ادارت میں رسالہ مخزن میں شائع کئے تھے۔ وہ نسخہ انھوں نے بعد اشاعت مضامین مجھے عنایت کرنے کا وعدہ کیا تھا جو پورا نہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے یہاں کے مشاعروں میں شریک ہونے کتنی ہی بار تشریف لائے۔ وہ میرے کئی دوستوں کے اچھے دوست ہیں۔ ان سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں مگر مجھ سے پھر بھی اُن کی ملاقات کسی نہ کسی وجہ سے نہ ہو سکی۔ ایک رات خالق دینا ہال کے ڈائس پر خوب تیز بجلی کی روشنی میں مجھ سے قریب بلکہ عین مقابل بیٹھے حسب معمول حالت جذب وسُکر میں دیر تک لہک لہک کر اور جوش وخروش کے ساتھ اپنے عقیدت مندوں کو اپنا کلام خصوصاً قطعات سناتے رہے۔ ایک بار تو ایسا محسوس ہوا جیسے انھوں نے خاص مجھے مخاطب کیا اور پہچان بھی لیا مگر پھر اُن کی توجہ ہٹ گئی۔ معلوم ہوا مجھے دھوکا ہوا تھا۔ کچھ اسی طرح کا واقعہ مجلس تعلیم ملّی کے جلسے میں بھی پیش آیا۔ پھر میں نے مشاعروں میں شریک ہونا ترک کر دیا۔

کچھ عرصے کے بعد جوش صاحب ہندوستان سے چلے آئے اور پاکستان کے شہری بن کر مستقل طور پر کراچی میں مقیم ہو گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اُن کے نیازمند اُن کے دولت کدے پر برابر حاضری دیتے رہتے ہیں۔ میں بھی اُن کے ہاں پہنچنے کے لیے موقع کا منتظر تھا، اگرچہ خالق دینا ہال اور تعلیم ملی کے جلسوں کے بعد یہ خوف ضرور ہو گیا تھا کہ ان سے ازسرِنو متعارف ہونا پڑے گا۔

مگر اب جونا کہاں اور بالکل غیر متوقع طور پر میرے پاس ان کا ٹیلی فون آیا تو میرا دل مختلف قسم کے احساسات کی آماج گاہ بن گیا۔ ایک طرف تو

؏ اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کے قسم کا احساس ہوا اور دوسری طرف اس طولانی داستان میں مندرج حالات کے پیش نظر اس کا یقین ہی نہ آیا کہ جوش صاحب نے مجھے ٹیلیفون کیا ہو گا۔ آخر اُن کو پاکستان اور خاص کر کراچی آئے اور یہاں قیام کیے ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا تھا اور اس اثنا میں اُن سے کوئی ملاقات بھی نہ ہوئی تھی۔ پھر آج کیا خاص بات تھی کہ انھیں میری یاد آئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ ماسبق)

ہوا۔ ماموں جان پر مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو میری خود نوشت "حیاتِ مستعار" جلد اول۔ مشفق خواجہ صاحب نے بھی ان پر خاصا کام کیا ہے۔

جوش صاحب کو جوابی ٹیلی فون کروں یا نہ کروں۔ کیا جانے کسی اور کو فون کیا ہو اور میرے فون سے مل گیا ہو۔ ایسی صورت میں وہ کیا مجھے سمجھا نہیں گے؟ اور میری خودداری کو جسے آج تک بڑی احتیاط سے پالتا پوستا رہا ہوں کس قدر زبردست ٹھیس لگے گی! آخر دل کو بہت مضبوط کرکے میں نے ان کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجی اور پوچھا "کیا جوش صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

کچھ دیر بعد بار بار آوازیں آئیں کہ "جوش صاحب تشریف لاتے ہیں، جوش صاحب تشریف لاتے ہیں۔" آخر جوش صاحب فون پر تشریف لائے۔ میں نے کہا" میں ہوں جلیل قدوائی ..... آپ نے مجھے فون کیا تھا؟ ..... میں آپ کو یاد ہوں؟ ....."

"بھئی مجھے تو کل ہی معلوم ہوا کہ آپ کراچی میں ہیں۔ آپ مجھ سے ملے کیوں نہیں؟"

"سبحان اللہ! میں تو تقسیم کے بعد سے برابر کراچی ہی میں ہوں۔ اور آپ کراچی میں مستقل طور پر مقیم ہونے سے پہلے بھی تشریف لاتے رہے اور ہم دونوں ساتھ بھی بیٹھ چکے ہیں ....."

"نہیں نہیں، مجھے تو کل خاں صاحب نے بتایا۔"

"کون خاں صاحب؟"

"وہ ملیح آباد کے خاں صاحب ہیں۔ آپ انھیں نہیں جانتے۔"

"اور وہ مجھے جانتے ہیں؟ آخر وہ کون ہیں؟"

"ان سے ایک دوسرے خان صاحب نے بتایا تھا۔"

"اچھا؟ وہ کون ہیں؟"

"آپ انھیں نہیں جانتے۔ وہ بھی ملیح آباد کے ہیں۔"

"وہ مجھے کب سے جانتے ہیں؟"

"یہ نہیں معلوم ..... لیکن بھئی میں خود آنے کو تیار ہوں۔"

"نہیں، نہیں جوش صاحب، حاضر تو مجھے ہونا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ مجھے آپ سے کب سے اور کتنا عشق ہے۔ آپ کو اپنی وہ غزلیں یاد بھی نہ ہوں گی جو مجھے بچپن سے ازبر ہیں اور جن پر آج بھی سر دھنتا ہوں۔ بھلا ان غزلوں کو کوئی بھلا سکتا ہے؟ کم از کم میں تو

نہیں بھلا سکتا۔ میرے دل پہ تو وہ نقش ہیں جیسے نقش کالحجر سے

جا رہا ہوں حسن سے آنکھیں ملانے کے لئے
زندگی کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے

مدعائے جستجوئے دوست ہے کامل سکوں
جاگتا رہتا ہوں گہری نیند آنے کے لئے

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

ہونٹ جب کانپے تو آنکھیں ڈبڈبا آئیں مری
داستاں کا آخری ٹکڑا سنانے کے لئے

غرقِ عشرت ہو کے جینے سے کہیں بہتر ہے جوش
درسِ عبرت بن کے مرجانا زمانے کے لئے!

یا

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا

ہزار شاخیں چمن میں لچکیں ہوا نہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے ملا نہ رنگِ شباب تیرا

بھلا ہوا جوش نے ہٹایا نگاہ سے چشمِ ترکا پردہ
بلا سے جاتی رہیں اگر آنکھیں کھلا تو بندِ نقاب تیرا

یا

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا ہم نے تجھے یاد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر سے برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت، کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا؟

"ارے ارے بس کیجیے، آپ کو میرے اتنے اشعار یاد ہیں" اُدھر سے آواز آئی۔

"جی نہیں۔ ابھی اور سنیئے۔" میں نے کہا ۔

نور رگوں میں دوڑ جائے پردہ دل جلا تو دو
دیکھنا رقص پھر مرا، پہلے نقاب اُٹھا تو دو
حال ہے غیر کس لئے؟ رنگ ہے زرد کیوں مرا؟
ہو جو بڑے ادا شناس اس کا سبب بتا تو دو
تم کو غرور و ناز ہے، تم ہو تغافل آشنا
اچھا اگر یہ بات ہے دل سے مجھے بھلا تو دو
نور کے تاج مہر و ماہ پاؤں نہ چومیں تب کہی
سنگِ درِ نیاز پر پہلے جبیں جھکا تو دو

یا

کچھ نہ رہ جائے بجز یک شعلۂ عالم فروز
اس طرح اجزائے ہستی کو جلانا چاہیئے
اوّل اوّل بھول جا ہر شے بجز یادِ حبیب
آخر آخر یاد بھی دل سے بھلانا چاہیئے
وضعِ عالم پر نہ جا، دیکھ اپنی اُفتادِ مزاج
دہر کو اپنی روش پر کھینچ لانا چاہیئے
تیری مسجودی کی خاطر کب سے ہے خم آسماں
ابنِ آدم! خاک سے اب سر اُٹھانا چاہیئے

تو دیکھا آپ نے میں شاعرِ انقلاب، جوش کا نہیں بلکہ ایک نئی غزل کے امام جوش کا شیدا ہوں اور کیسا کچھ۔۔۔

"بھئی واللہ! آپ نے کمال کر دیا۔ یہ تو میرا شاید ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء کا کلام ہے اور مجھے یاد کیا بالکل پسند نہیں ہے۔ غزل کے بارے میں میرے خیالات بدل چکے ہیں اور میں اسے اُردو شاعری کی کمزور ترین صنف سمجھتا ہوں۔"

"یہ اُردو ادب کا بدترین سانحہ ہے!"

"تو بھئی آپ مجھ سے ضرور ملیں۔ آپ سے مل کر میرے خیالات کی اصلاح ہو جائے گی۔"

اور جوش صاحب نے مجھے اپنی قیام گاہ کا مفصل پتہ بتایا اور ٹیلی فون نمبر بھی نوٹ کرایا۔ میں نے وعدہ کیا کہ جلد ہی حاضر خدمت ہوں گا۔

مجھ میں ایک کمزوری بری ہے کہ نئی جگہ یا کسی کے ہاں پہلی بار تنہا جانے سے گھبراتا ہوں۔ جگہ کا پتہ چلانے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں انھیں دور کرنے میں اگر کوئی شریک ہو تو منزل آسانی سے سر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی ساتھی ہو تو پہلی ملاقات کا حجاب یا تکلف بھی بٹ جاتا ہے اور بے تکلفی کے لئے راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انتظار میں رہا کوئی صاحب ملیں جن کے ساتھ جوش صاحب کے ہاں جاؤں۔ اتفاق سے کچھ دن بعد ڈھاکا سے میرے دوست عزیز احمد خاںؔ یوروپی ممالک کو بھیجے جانے والے ایک صحافتی مشن کے رکن کی حیثیت سے کراچی آئے اور جانے سے پہلے میرے ہاں ٹھہرے۔ ان کا اور جوش صاحب کا حیدرآباد دکن میں ساتھ رہ چکا تھا۔ اور دونوں ایک دوسرے سے بہت بے تکلف تھے۔ عزیز صاحب کو معلوم ہوا کہ جوش صاحب کراچی مستقل طور پر تشریف لے آئے ہیں تو ان

ؔ مرحوم ہو گئے۔ پرانے علیگ تھے اور حیدرآباد دکن میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر نشر و اشاعت رہ چکے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب میں ڈاکٹر زور کے مشاعرہ میں حیدرآباد گیا تھا میری بڑی خاطر داریاں کی تھیں۔ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان میں ڈھاکا سے "ینگ پاکستان" ہفتہ وار نکالتے تھے۔ محترم ہاشم رضا ہمارے کمپنی کے انفارمیشن سکرٹری اور اب میرے بے حد قدرداں کے بھی احباب میں سے تھے۔

سے ملنے کے خواہش مند ہوئے۔ چنانچہ ایک شام وقت مقرر کر کے ہم دونوں جوش صاحب کے ہاں پہنچے۔ میں غزل کی شاعری پر گفتگو کرنے کے لئے اپنے دل میں بڑے بڑے منصوبے بنا کر لے گیا تھا اور جوش صاحب کی غزلوں کے نہ جانے کتنے اور شعر میری زبان سے ان کے سامنے نکلنے کے لیے بے تاب تھے مگر میرے افسوس کی انتہا نہ رہی کہ ان سے اس قسم کی باتوں کا کوئی موقع ہی نہ آیا۔ سچ پوچھیے تو ہماری تقریباً دو گھنٹے کی طولانی نشست میں کوئی ادبی یا علمی بات ہی نہ ہوئی بلکہ نفیس دونوں کے درمیان حیدرآباد میں اُن کے قیام کے زمانے کی باتیں ہوتی رہیں۔ حیدرآباد کی سیاست، ریاست کا زوال، مشترک دوستوں کے حالات، کسی جنگ یا دولہ کے قصے، بعض رنگین صحبتیں اور نہ جانے کون کون سے امور زیر بحث آئے جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور میں عزیزہ کے ساتھ بے نیل و مرام اپنے گھر واپس آ گیا۔

عرصہ ہو گیا پھر ہماری ملاقات ایک دوسرے سے نہ ہوئی۔ تا آں کہ محبی ثاقب[1] کانپوری اپنے صاحبزادہ ابوالخیر کشفی[2] کی شادی کرانے ہندوستان سے کراچی آئے۔ ایک دن وہ میرے پاس تھے کہ جوش صاحب کا تذکرہ آ گیا اور انھوں نے مجھ سے ان کے ہاں چلنے کو کہا۔ میرے دل کی گویا تمنا بر آئی۔ چنانچہ ہم دونوں جوش صاحب کے ہاں پہنچے۔ پچھلی بار ہم اُن کے کمپاؤنڈ میں نصب شدہ ایک خیمے میں بیٹھے تھے۔ اس بار نشست اُن کے گول کمرے میں ہوئی جو طرح طرح کی کرسیوں اور صوفوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دیوار سے لگا ہوا بڑا سا تخت تھا جس پر سفید چاندنی اور قالین بچھے تھے۔ وسط میں دیوار ہی سے لگا ہوا ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ ثاقب تو اپنی فطری بے تکلفی کے ساتھ جھٹ جوتے اتار، اُچک کر تخت پر جا بیٹھے اور گاؤ تکیہ سنبھال لیا۔ میں تخت کے پائیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوش صاحب

---

[1] سید ابو محمد ثاقب مرحوم

[2] اب ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، نامور دانشور، سابق صدر شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی۔

بھی تخت پر ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ کمرے میں اُن کے چار چھ نیاز مند اور تھے جو نہ جانے کیوں سارا وقت بار بار اندر باہر آتے جاتے رہے۔ کچھ نئے ملاقاتی بھی آئے۔ ٹیلی فون پر پیام و سلام بھی ہوتے رہے جن کے لیے جوش صاحب کو بار بار اُٹھنا پڑا۔ کسی صاحب سے بعض کاغذات کی نقلوں کے بابت گفتگو ہوئی۔ ایک دوسرے صاحب سے سمنٹ کے کاروبار اور نفع وغیرہ پر سوال جواب ہوتے رہے۔ ثاقب صاحب سے ہندوستان کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ میں جوش صاحب کی توجہ اس بار بھی حاصل نہ کر سکا۔ اور شعر و ادب کی گفتگو کا موقع نکالتا اور ماحول تلاش کرتا ہی رہ گیا۔ غروب آفتاب کا وقت تھا۔ کسی نے ایک طرف سے ایک پلیٹ میں جالی سے ڈھکا ہوا ایک گلاس جس میں "کیا چیز حرام ہو گئی ہے"[1] بند تھی جوش صاحب کے آگے لا کر رکھ دیا۔ پھر کیا تھا دہ غالب کے اس شعر کی زندہ تصویر بن گئے ؎

پھر دیکھیے انداز گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

بڑے چاؤ اور پیار سے آہستہ آہستہ پینے اور کچھ اس قسم کی باتیں کرنے لگے "بھئی اب تو ہم آئی ہی سی کے پابند ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ہماری بیگم صاحب کے طفیل مل جاتی ہے ۔۔۔ اور چوبیس گھنٹوں میں اب ہم صرف اس وقت پیتے ہیں یعنی دونوں وقت ملتے ۔۔۔ اور جن معنوں میں منع کی گئی ہے انھیں معنوں کے اندر رہ کر پیتے ہیں یعنی نشہ نہیں ہونے دیتے ۔۔۔ اور منع بھی نہ جانے کب کی گئی اور کیوں کی گئی اور کن لوگوں کو منع کی گئی ۔۔۔ ہم تو بڑے نیک لوگ ہیں ۔۔۔ ابھی ختم کر دیں گے، دیر نہیں لگاتے ۔۔۔ سونے سے پہلے دماغ بالکل صاف ہو جاتا ہے، سب کچھ بھلا دیتے ہیں ۔۔۔ آپ لوگوں کی طرح نہیں ہوتے، دن بھر کے غم و فکر، اُلجھنیں، انتشار، پراگندگی، سراسیمگی لیے ہوئے ۔۔۔ ہم تو بالکل معصوموں کی طرح سوتے ہیں، ہلکے

---

[1] کچھ زہر نہ تھی شراب انگور کیا چیز حرام ہو گئی ہے! (ریاض خیرآبادی)

بھلکے" بس بچوں کی طرح جیسے آج بلکہ اسی وقت پیدا ہوئے ہوں....
وغیرہ مگر ثاقب صاحب کو مغرب کی نماز کی جلدی تھی اور انھوں نے مجھے اشارہ
کیا۔ چنانچہ ہم دونوں نے اس دل چسپ ترین گفتگو کے باوجود جوش صاحب
سے اجازت طلب کی۔

عرصہ دراز کے بعد ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ جوش
صاحب کے نقیب حضرت ساحل بلگرامی کمرے میں داخل ہوئے اور زور
زور سے اعلان کرنے لگے کہ جوش صاحب تشریف لائے ہیں، جوش صاحب
تشریف لائے ہیں اور باہر موٹر میں بیٹھے ہیں۔ نیز یہ کہ انھوں نے ساحل
صاحب کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ جعفری صاحب کمرے میں موجود
ہیں یا نہیں۔ جعفری صاحب کمرے میں موجود تھے۔ ساحل صاحب تھوڑی
دیر کمرے میں ٹھہرے۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان کا خیال تھا کہ جعفری صاحب کو
ان کے ہمراہ جوش صاحب کو لینے کے لیے موٹر تک جانا چاہیے۔ مگر جعفری
صاحب نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تو وہ قدرے تامل کے ساتھ کمرے
سے باہر چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد جوش صاحب، ساحل صاحب اور ایک
کوئی اور بزرگ بڑی آن بان سے کمرے میں داخل ہوئے۔ جعفری صاحب
اپنی عادت کے مطابق کھڑے ہوکر خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی تعظیم بجا
لائے اور بیٹھنے کو کرسیاں پیش کیں۔

اگرچہ جوش صاحب جعفری کے پاس تشریف لائے تھے مگر یہ کیسے
ہوسکتا تھا کہ میں کمرے میں موجود ہوں اور ان کا استقبال نہ کروں چنانچہ
میں بھی اپنی جگہ پہ اٹھ کھڑا ہوا بلکہ "السلام علیکم" بھی عرض کیا۔ مگر جوش
صاحب اپنے خیالات میں کچھ اس درجہ گم تھے کہ نہ مجھے دیکھ سکے نہ میرے
سلام کو سنا، حالاں کہ میں کمرے میں داخل ہونے والے دروازے کے بالکل
سامنے والی میز کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور جعفری صاحب کے بائیں ہاتھ کی طرف
جس کرسی پہ جوش صاحب بیٹھے تھے وہ بھی میرے بالکل مقابل تھی۔ جوش
صاحب نے بیٹھتے ہی ایک مرتبہ زور سے لاحول ولا قوۃ پڑھا اور اپنی بغل
سے ایک بستہ نکالا جس میں کاغذات کا ایک پلندہ لپٹا ہوا تھا۔ یہ کاغذات

انھوں نے جعفری صاحب کی میز پر ڈال دیے۔ بعد میں معلوم ہوا یہ جوش صاحب کی اُردو میں تیار کی ہوئی کوئی اسکیم تھی اور پاکستان کے حکام بالا کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے جعفری صاحب کو اس کا انگریزی ترجمہ کرنا تھا۔ جعفری صاحب نے اسکیم کے مسودہ کو بہ آوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ کوئی دس پندرہ منٹ تک رہا اور احباب نے ہر ہر فقرہ پر داہ واہ سبحان اللہ کا وہ شور برپا کیا کہ میں جو اس کمرے میں سب کے سامنے مگر الگ تھلگ سا تھا اسکیم کے معنی و مفہوم کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ سکا۔ سارے وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا رہا جیسے مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانۂ عجائب" کی حسبِ ذیل زبان میں بے ثباتیِ عالم کا ذکر ہو رہا ہو۔ "دنیائے دوں عبرت و دید کی جا ہے، اپنے کام میں مصروف قضا ہے، جو شے ہے فنا ہے ... " بلکہ اس سے بھی بہتر "گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن، یعنی محرّرانِ رنگین تحریر و مقرّرانِ جادو تقریر نے اشہبِ جہندۂ قلم کو میدانِ کارزار میں گرم عنان و جولاں یوں کیا ہے کہ۔" [1]

مجھے اس ہجوم میں اپنی تنہائی کا بھی شدید احساس ہو رہا تھا۔ چنانچہ طبیعت سخت متعفن ہوئی بلکہ سر میں درد ہونے لگا اور میں چپکے سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کمرے کے باہر چلا گیا۔ چپراسی سے کہا گیا کہ فلاں صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ جب یہ سب لوگ چلے جائیں تو مجھے خبر کر دینا۔

یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ ترجمہ کے سلسلے میں جعفری صاحب کے ہاتھوں جوش صاحب پر کیا گزری مگر اس دل چسپ اور یادگار نشست میں مجھ پر جو گزری اس کا تذکرہ میں نے دو ایک دوستوں سے کیا۔ یہ بات جوش صاحب

---

[1] پنجاب کے مہاسبھائی اُردو اخبارات نے تقسیمِ ملک سے قبل مسلم اہلِ قلم سے زبان کے معاملے میں خوب بدلہ لیا تھا مثلاً اس عبارت کا مفہوم بتایئے "شتابدی پر شتابدی بیت رہی ہے مگر سمیا پرانت کے پار کی سمسیا اب تک حل نہیں ہو سکی ہے"! یہ روزناموں "پرتاب" یا "ویربھارت" لاہور کے ایک اداریہ سے ماخوذ ہے۔

تک پہنچی اور مجھے بتایا گیا کہ فرماتے تھے کہ مسودہ کا پڑھنا ختم ہوتے ہی وہ میری طرف رُخ کرتے مگر اس سے پہلے ہی میں کمرے سے اُٹھ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

ایک بار، بس صرف ایک بار ایسا معلوم ہوا کہ جوش صاحب دفتر میں خاص میرے پاس تشریف لائے ہیں۔ دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ مگر میں دفتر میں دیر تک بیٹھنے کا عادی تھا۔ یہ جوش صاحب سے تنہائی میں مفصل ملاقات کا ایک نہایت اچھا موقع ہو سکتا تھا۔ وہ بغیر کسی دھوم دھام کے تشریف لائے تو میں تعظیم بجا لانے کو کھڑا ہو گیا بلکہ کچھ آگے بڑھ کر میں نے ان کا استقبال کیا۔ جوش صاحب نے جواباً نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے مضبوط ہاتھوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ کر سینہ سے لگا لیا۔ مگر انھوں نے میری کوئی خاطر مدارات قبول نہیں کی۔ سگریٹ شاید وہ پیتے نہیں کیوں کہ میں نے پیش کی تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔[1] پانوں کا ڈبہ اور بٹوہ اُن کے ساتھ تھا۔ چنانچہ پان کھایا اور مجھے بھی کھلایا۔[2] دیر تک بیٹھے رہے۔ مجھے اُن دنوں فراق گورکھپوری کی اساتذہ کے اشعار غلط نقل کرنے کی عادت پر ایک مضمون لکھنا تھا اُس پر کام کر رہا تھا۔[3] ترقی اردو بورڈ[4] اور لغات کے کام پہ بات چیت شروع ہوئی مگر عین اس وقت جب گفتگو میں کچھ گرمی آچلی تھی ایک چپراسی کمرے میں داخل ہوا جسے دیکھ کر جوش صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوا وہ درحقیقت

۱۔ یہ مضمون غالباً ۱۹۵۹ء میں لکھا گیا تھا جب میں نے سگریٹ نوشی ترک نہیں کی تھی۔

۲۔ اب پان کھانا بھی مدت سے ترک ہے۔

۳۔ اس مضمون کا عنوان "غلط نامۂ فراق گورکھپوری" تھا اور "فاران" کراچی میں شائع ہونے کے بعد اب یہ میرے مجموعے "شعراء اور شعریات" میں شامل ہے۔

۴۔ اب اردو ڈکشنری بورڈ۔ کراچی۔

مجید ملک[۵] سے ملنے آئے تھے مگر اس وقت وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے اور زیبا صاحب[۶] بھی جا چکے تھے جن سے اُن کے حیدرآباد دکن کے زمانے سے تعلقات تھے۔ لہٰذا وقت گزاری کے لیے میرے پاس آ بیٹھے تھے۔

اس کے بعد سے جوش صاحب سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی اگرچہ زیبا صاحب کے پاس کمرے سے ملحق کمرے میں وہ آکر بیٹھتے اور دیر دیر تک دادِ سخن دیتے تھے۔ ہاں جب تک میں سرکاری ملازمت میں رہا یہ ضرور تھا کہ زیبا صاحب کے پاس آتے جاتے کبھی کبھار دفتر کی گیلری میں جوش صاحب سے سلام دعا ہو جاتی تھی، بہ قدرِ اشکِ بلبل، کچھ اس قسم کی :-

"السلام علیکم"
"وعلیکم السلام"
"مزاج اچھے ہیں؟"
"آپ کی دعا ہے"۔

مگر میرے ملازمت سے سبک دوش ہو جانے کے بعد وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔[۷]

---

۵ کرنل مجید ملک مرحوم۔ پرنسپل انفارمیشن آفیسر و پبلسٹی ایڈوائزر، حکومتِ پاکستان۔ ان پر میرا مضمون میرے مجموعۂ "چند اکابر چند معاصر" میں ملے گا۔

۶ سید علی حسنین زیبا مرحوم۔ اس وقت پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر تھے۔ پختہ اور کامیاب شاعر تھے اور نقدِ شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ اردو کے بڑے مشاق اور کامیاب مترجم بھی تھے۔

۷ یہ مضمون جوش صاحب سے میرے "تعلقات" کی تصویر کا ایک رُخ ہے۔ اس لیے کہ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد حسنِ اتفاق سے میں نے اپنی سابق قیام گاہ واقع جیبن ڈی سلوا ٹاؤن میں مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا اور زیبا صاحب کی بدولت جوش صاحب سے میرے مخلصانہ بالطبع تعلقات قائم ہو گئے۔ زندگی باقی ہے تو ان تعلقات کا تذکرہ ڈاکٹر ہادی حسن کے ناقابلِ تقلید الفاظ میں "انشاءاللہ فردا" کسی اور مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

قاضی جلال الدین

پاس تو وہ میٹرک بھی نہ تھے مگر الیف۔آر۔جی۔ایس (فیلو آف دی رائل جیاگرافیکل سوسائٹی) تھے اور بہ حیثیت لکچرر یونیورسٹی کی جماعتوں کو جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہندوستان میں پہلی یونیورسٹی تھی جہاں جغرافیہ کا باقاعدہ شعبہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج ٹوٹنے پر اس کے پرنسپل میجر ڈین شعبہ کے ریڈر اور صدر ہوئے مگر اس کی اصل ترقی ڈین صاحب کے چلے جانے کے بعد شروع ہوئی جب ڈاکٹر عبادالرحمن خاں کا ان کی جگہ پر تقرر ہوا۔ اس شعبہ کی ترقی کی دیکھا دیکھی برصغیر کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی جغرافیہ کی اعلیٰ تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

قاضی جلال صاحب K.M. JALALUDDIN لکھے جانے کی وجہ سے کانے ماسٹر جلال الدین بھی کہلاتے تھے (جوں کہ یک چشم تھے)۔ ایف آر جی ایس کس طرح ہوئے یہ مجھے معلوم نہیں، نہ میں ان کا شاگرد رہا کہ جغرافیہ کے سلسلے میں ان کے بارے میں کچھ کہہ سکوں مگر ان کی زبان سے "سیروا فی الارض" بارہا سنا جسے وہ جغرافیہ کے مضمون سے اپنی دلچسپی کی بنیاد بتاتے تھے۔ وہ ایس ایس ہال (ایسٹ) یعنی پکی بارک (مشرقی حصہ) کے وارڈن بھی تھے اور طلبا و اساتذہ میں اپنی ذہانت اور ذوقِ ظرافت کے باعث یکساں مقبول و محترم تھے۔ بلکہ اس لحاظ سے وہ ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ سونے کی کمانیوں والی عینک لگاتے تھے جس کے نچلے حصے میں آدھے شیشے لگے ہوتے یعنی ان کی پڑھائی کی بصارت کمزور تھی۔ کوٹ، پتلون، ٹائی استعمال کرتے تھے مگر اس طرح جیسے لباس کے اہتمام سے بے نیاز ہوں۔ مسکراہٹ ہر وقت، خاص طور پر بر وقت ملاقات، ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔ جہاں تک یاد آتا ہے وہ ۱۹۳۶ء میں میرے علی گڑھ چھوڑنے سے قبل ملازمت ختم کر کے چلے گئے تھے۔

میں نے "علی گڑھ منتھلی" کے، جو یونیورسٹی کے طلبا کے رسالہ "علی گڑھ میگزین" کا پرانا نام تھا اور جسے رشید احمد صدیقی صاحب اور ان

کے بعد میرے نہایت محترم اور قابل دوست خواجہ منظور حسین نے اپنے ادارتی آدوار میں ملک کا ایک مستند ادبی و علمی پرچہ بنا دیا تھا، کچھ پرانے پرچے دیکھے تھے معلوم ہوا قاضی صاحب کسی زمانے میں اس کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ اُن کے ذوق ادب کے نمائندہ یہ اشعار "منتھلی" کی اشاعت میں چھپے تھے جنھیں لطف سے خالی کیوں کر کہوں جب کہ وہ غزل کی پرانی اور اصلی تعریف "سخن با زنان کردن" پر پورے اترتے ہیں۔ آخر مولانا حسرت نے بھی تو ناسفانہ شاعری کی حمایت اور شد و مد سے اس کی حمایت بھی کی[۱]۔ ہمارے اساتذہ نے غزل کا ایک مخصوص مقصد و مصرف مقرر کیا تھا۔ دوسرے مضامین کے لیے ہماری شاعری میں کتنی ہی اور اصناف تھیں اور ہیں۔ مگر یار لوگ ہاتھ دھو کر غزل ہی کے پیچھے پڑ گئے۔ اور اس کی گردن پر کند چھری پھیر دی۔ دوسرے الفاظ میں ہرن پر گھاس لادنے کے درپے ہو گئے۔ مگر اکبر کے الفاظ میں:

ع ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس[۲]؟

---

[۱] "فاسقانہ شاعری کو بدمذاقی پر محمول کرنا، سوقیانہ و مبتذل قرار دینا انصاف کا خون کرنا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلّم ہو تو پھر اس کے دائرے صرف پاک جذبۂ عشق تک محدود کر دینے اور عامۃ خلائق کے ۹۹ فی صد جذبات ہوس کو اس سے ضائع کر دینے کی کوشش خود مخالفین ہوس نگاری کی انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری کے سوا کسی اور چیز پر دلالت نہیں کرتی۔" (حسرت)

[۲] موقع تو نہیں مگر اکبر کا دلچسپ قطعہ جس سے یہ مصرع مستعار لیا گیا ہے سنائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا ؎

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
سناؤں تم کو ایک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ادھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ مزا یہ ہے کہ اس قسم کی چیزیں جن کا ذکر ہماری روایتی غزل میں ہوتا ہے اور جو غزل کی جان ہیں اگر مغرب سے آتی ہیں تو ہم ان پر سر دُھنتے ہیں بلکہ انگلستان پلٹ احباب مست ہو کر انھیں گاتے ہی نہیں بلکہ ناچنے لگتے ہیں۔

خیر تو قاضی صاحب کے وہ اشعار یہ ہیں ؎

جب کہا رحم کے قابل ہے دلِ زار، کہا
جی دلِ زار! دلِ زار کے ٹکڑے کر دے
وعدۂ وصل کو پوچھا تو یہ شرما کے کہا
تم بڑے وہ ہو تمھیں مار کے ٹکڑے کر دے

زبان کا لطف ملاحظہ ہو مگر زبان اور محاورے کی بات پہ ہمارے احباب چڑنے اور ناک بھوئیں سکیڑنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ زبان تو اُن کے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ جیسا چاہو برتاؤ کرو، حالانکہ ہمارے ہاں لونڈی کے ساتھ برتاؤ کا بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ تھا۔

قاضی صاحب کا خیال تھا کہ انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ اصل میں اُردو کے الفاظ یا فقروں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ فرماتے تھے کہ جب انگریز ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے تو گھروں میں پردہ دار خواتین سے انھیں دور رکھنے کے لیے ان سے کہا جاتا تھا:

"اُدھر نہ جائیں وہاں خواتین ہیں جو پردہ کرتی ہیں"

پردہ کرتی ہیں کا فقرہ کثرتِ استعمال سے مختصر ہو کر صرف "کرتی ہیں" رہ گیا۔ بعد میں یہ انگریزوں کی زبان پر چڑھ کر "کرٹین" (CURTAIN) ہو گیا اور انگریزی میں اس نے پردہ کی جگہ لے لی۔ اسی طرح اُردو کا فقرہ "دیکھو

(بقیہ حاشیہ صفحۂ ماسبق)

کہاں وہ فطرتی جوشِ طبیعت	کہاں ٹھونسی ہوئی چیزوں کا آماس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے	ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی	مجھے سمجھا ہے کوئی ہرن داس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ	تو استعفا مرا با حسرت و یاس

رسے نشان" انگریزی میں تبدیل ہو کر ڈیکوریشن (DECORATION) ہو گیا۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے الفاظ پر مشتمل قاضی جلال صاحب نے ایک لغت مرتب کی تھی۔ اُردو کے بہت سے الفاظ کی وجہ تسمیہ بتاتے تھے۔ مونچھ کی بابت کہتے تھے" مُنہ (موں) کو چھوتی ہوئی جاتی ہے۔ اور پونچھ کی مثال دیتے تھے جو (پوں) کو چھوتی ہوئی جاتی ہے۔

بڑے خوش اوقات انسان تھے۔ راس مسعود صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ مسٹر ای۔ اے ہورن[1] رکن انڈین ایجوکیشنل سروس کو پرو وائس چانسلر کے طور پر لائے تھے۔ یونیورسٹی بڑی چھٹیوں کے بعد کھلی تھی اور داخلے کے لیے طلبا کا اژدہام تھا۔ ایک بار رات کے دس بج گئے۔ دفتر کھلا رہا اور داخلے ہوتے رہے۔ اتنے سخت اور طویل انٹرویو شاید ہی اس سے پہلے کبھی ہوئے ہوں۔ ہورن صاحب دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ذرا دیر کو اٹھنے کے سوا برابر ڈٹ کر کام کرتے رہے سارا عملہ تھک

---

[1] واضح ہو کہ یہ وہی مسٹر ہورن تھے جنھوں نے مسعود صاحب کے دوست اور مشہور انگریزی ادیب و مصنف ای ایم فوسٹر کی مشہور تصنیف سفرنامۂ ہند (A PASSAGE TO INDIA) کے بعض بیانات پر ایک خط کی شکل میں سخت تنقید کی تھی اور اسے نیو اسٹیٹس مین (NEW STATESMAN) میں چھپوایا تھا۔ فوسٹر نے اپنی اس کتاب میں ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کی جو تصویر کھینچی تھی ہورن صاحب نے اسے غلط قرار دیا تھا۔ اس کتاب میں عزیز نام کا بھی ایک کردار ہے جو مسعود صاحب کا چربہ ہے۔ اسے مصنف نے مسعود صاحب کو ڈیڈیکیٹ کیا ہے جنھوں نے فوسٹر کو ہندوستان بلا کر صورت حال کے مطالعے کا موقع دیا اور بہت سا مسالہ خود فراہم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں اور ان کی حکومت کو ہندوستان میں غیر مقبول بنانے میں فوسٹر کی کتاب کا بھی بڑا حصہ ہے "A PASSAGE TO INDIA" کے ڈرامے بھی کھیلے گئے۔ اس پر فلم بھی بن چکی ہے اور ٹی وی (T.V) پر بہت مقبول ہے۔ اس کتاب کو انگریز حکام انگلستان جاتے وقت سمندر میں پھینک دیتے تھے۔

گیا۔ جب کام ختم ہوا اور وہ چلے گئے تو ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لیے نیچے اُترے۔ جیسا کہ معلوم ہے یونیورسٹی کے دفاتر وکٹوریہ گیٹ کے اوپر تھے اور نیچے ایس ایس ہال (یکی بارک) ہے۔ وہاں قاضی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ہم لوگ ہورن صاحب کے احساس ذمہ داری اور جم کر بیٹھنے کی صلاحیت پر عش عش کرنے لگے۔ ایک صاحب نے کہا" کیوں نہ ہو آخر تین ہزار روپے ماہوار بھی تو لیتے ہیں"۔

قاضی صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ جھٹ ان کی بات کاٹ کر بولے: " بھئی، ہمیں دو روپے کم دے کر دیکھ لو" !

مخمور اکبر آبادی

بد قسمتی سے میں نے پروفیسر عبد الغفور شہباز کی مشہور تالیف "کلیاتِ نظیر" اور ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "زندگانی بے نظیر" نہیں پڑھی۔ نظیر کے کلام کے دوسرے متعدد مجموعے بھی میری نظر سے نہیں گزرے۔ اس بے نظیر شاعر پر میں نے پہلی اور خاصی مشرح و مفصّل کتاب "روحِ نظیر" پڑھی اور وہی مجھ سے اس کے نہایت فاضل مصنف اور میرے بہت ہی پیارے دوست سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی مرحوم سے غائبانہ تعارف کا وسیلہ بنی۔ کتاب کی اشاعت ۱۹۲۲ء میں ہو چکی تھی[1] جس سال میں علی گڑھ

---

[1] اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا پہلے سے کہیں زیادہ ضخیم، مربوط، مبسوط اور مضبوط کہا جاتا ہے۔ میرے علم میں دونوں ہی ایڈیشن پاکستان کے بازاروں میں نہیں ملتے۔ اس دوسرے ایڈیشن کے مخمور صاحب کے پاس پاکستان آنے کے وقت چھ نسخے تھے جو تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک اُن پاس رہ گیا تھا جسے انھوں نے مجھے دکھانے کا وعدہ کیا تھا مگر جو صاحب اسے ان سے عاریتاً لے گئے تھے انھوں نے واپس نہیں کیا۔ اور بقول یارِ عزیز خواجہ غلام السیدین مرحوم اس سے بڑا ظلم یہ کیا کہ اُن کے حافظہ سے اپنا نام بھی فراموش کر دیا۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی (مخمور صاحب کے "چوبے جی") ہندی کے مشہور اخبار وشال بھارت (کلکتہ) کے ایڈیٹر اور آل انڈیا ہندی جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے صدر، بعد میں رکنِ بھارت راجیہ سبھا تھے جنھوں نے ۱۹۵۶ء میں آگرے میں "یوم نظیر" کی صدارت کی تھی۔ "روحِ نظیر" کے مصنف کو ۳ اکتوبر سال مذکور کو لکھا تھا "مجھے یقین ہے کہ اس سے بہتر کتاب لکھی جانی دشوار ہے"۔ چوبے جی کے دو خط مخمور صاحب نے مجھے عنایت کیے تھے۔ اپنی حیاتِ مستعار کے اس موقع پر کہ تقریباً نوے سال کا ہو چکا یہ دونوں خط میں نے محبی مشفق خواجہ کو جو ماشاء اللہ جواں سال ہیں اور مدت تک رہیں گے محفوظ کرنے کو دے دیئے ہیں۔

کے انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں داخل ہوا مگر مجھے اس کا مطالعہ بہت دیر سے نصیب ہوا۔ اس کے بہت عرصے کے بعد غالباً ۱۹۳۹ء کے اواخر میں خود محمور صاحب سے نئی دہلی میں اپنے غریب خانے واقع میردرد روڈ پر بالمشافہ ملاقات ہو گئی یعنی وہ خود مجھ سے ملنے تشریف لے آئے۔

برس ہا برس بعد جب ہماری دوستی بہت پرانی ہو چکی تھی مگر ان کی وفات حسرت آیات[1] کے بعد نظیر کے بارے میں پاکستان میں شائع شدہ ان کی دوسری اور نہایت مبسوط کتاب "نظیر نامہ" دیکھنے کو ملی[2]، اگرچہ کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کے بعض حصوں کی "قومی زبان" میں اشاعت میں میرا دخل رہ چکا تھا۔ یہ "روح نظیر" کے بعد کی محمور صاحب کی نظیر پر سالہا سال کی تلاش و تحقیق اور کاوش کا نتیجہ تھی اور شاعر مذکور پر کم و بیش آخری لفظ۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے درمیانی وقفے میں انھوں نے غالب پر اپنے مضامین کا مجموعہ "سرود وصنوبر" "اردو زبان اور اسالیب" نیز "قاموس الفصاحت" شائع کیں اور یہ تینوں کتابیں بھی میری نظر سے گزریں۔ وہ زبان اور محاورے کے رسیا بلکہ دونوں کی سند تھے اور اعلیٰ ترین درجے کے غالب شناس بھی۔ وہ نقاد تھے اور اپنے مخصوص اسلوب سے تنقید کو تخلیقی ادب[3] بنا دینے کا فن جانتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کا اوڑھنا

---

[1] محمور صاحب کی وفات کو میں نے "حسرت آیات" رسماً نہیں لکھا ہے۔ آگے چل کر ان کے دل خراش حالات سے ان الفاظ کی صداقت بخوبی واضح ہو جائے گی۔

[2] افسوس یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی جس کے دیکھنے کی انھیں بڑی تمنا تھی۔ کراچی میں کتابت کروا رہے تھے اگرچہ خود خیرپور میں مقیم تھے۔

[3] محمور صاحب کے تخلیقی ادب کا نمونہ :-

"کمال کا وجود آپ اپنا اعتراف ہے۔ اس کی حقیقی و معنوی قدر کسی اعتراف کی محتاج نہیں ہے۔ اسی جہت سے میاں نظیر کا کمال کسی خارجی یا نمایشی اعتراف کا بھوکا نہیں ہے۔ مقبولیت اور نام نہاد گمنامی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بجھونا یعنی اول و آخر موضوعِ سخن نظیرؔ ہی تھا اور اس شاعر پر تنقید کے علاوہ انھوں نے جو کام کیا ہے اس کے پیشِ نظر انھیں تذکرہ نویسی کا امام کہا جا سکتا ہے۔

جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ چھریرے جسم کے حسین و جمیل، بلند قامت ہنس مکھ جوان تھے۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی شیروانی پہنتے تھے۔ غالباً ہاتھ میں بید اور سر پر ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ ان کی پاٹ دار آواز تھی۔ وہ آگرے میں وکالت کرتے تھے مگر "روحِ نظیر" کی اشاعت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ ماسبق)

دونوں حالتوں میں ان کی شاعری کی حقیقی و معنوی قدر برقرار رہتی ہے۔ موتی جس جوہر کا نام ہے وہ جوہری کے گلاس کیس یا سمندر کی تہہ دونوں جگہ موتی ہی کا قلم رکھتا ہے۔ کمال کے مقابلے میں گمنامی اور شہرت کا فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی صورتِ حال میں معاشرہ کمال سے منفعت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے اخلاقی و وجدانی مفاد سے بالعموم محروم رہتا ہے لیکن دوسری صورت میں کمال جب بروئے کار آجاتا ہے تو اس کی نمائش کسی حقیقی یا معنوی تغیر کی وجہ سے نہیں بلکہ نظروں کے تغیر کی وجہ سے ہوتی ہے۔

"میاں نظیرؔ کا جوہر اپنی جگہ موجود تھا لیکن انیسویں صدی کے آخری دور اور بیسویں صدی کے پہلے ربع کی ہندوستانی آنکھیں ان کے کمال کا جوہر پرکھنے سے قاصر تھیں۔ "آبِ حیات" کے مصنف نے اگر ان کو نظر انداز کیا تو محض اس بنا پر میاں نظیرؔ کی بے کمالی یا آزادؔ کی جوہر ناشناسی ثابت نہیں ہوتی۔ جو ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ خود نفسِ ذوق میں اتنا بلوغ پیدا نہ ہوا تھا کہ آسمانِ شعر کے عروجی منازل میں اڑان بھر سکتا۔ مغرب کی نیچرل شاعری کا ملک میں دور دورہ ہوتے ہی اس لیے بھی میاں نظیرؔ کی اہانت پر کمر باندھی گئی کہ بعض اربابِ قلم اس نوع کے ذوق و بصیرت کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتے تھے۔ میاں نظیرؔ کی گمنامی بہر طور وہ گمنامی ہے جس پر بے شمار شہرتیں قربان ہیں۔"

سے پہلے وہ شاہ دلگیر کے رسالے "نقاد" کے ذریعے شعر و ادب کی دُنیا میں خاصا نام پیدا کر چکے تھے۔ اُن کی نظمیں نوجوانی کی ترنگ کی سچی تصویریں ہوتی تھیں اور جوشِ بیان میں وہ بعض دفعہ اعتدال قایم نہ رکھ پاتے تھے۔ اس زمانے کا اُن کا ایک مصرعہ ہے

ع ساڑھی میں تری پنہاں روحِ صنمستان ہے[1]

نیاز صاحب نے جب آگرے سے "نگار" نکالا تو "یارانِ نجد" کے نام سے اس کے بانیوں کا جو حلقہ بنا تھا اس میں نیاز، ضیائی، ل۔ احمد، فانی، مانی کے ساتھ مجنوں بھی شامل تھے اگرچہ وہ اس حلقے کے سب سے کم سِن رکن تھے۔ انھوں نے اسی دَور کے لگ بھگ کچھ نصابی کتابیں بھی لکھی تھیں اور آگرہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہاں کے بعض امتحانات کے ممتحن نیز یونیورسٹی کی اعلیٰ انتظامی جماعتوں کے رکن بھی رہے۔

تقسیم سے چند سال پہلے وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں آ گئے تھے۔ اس زمانے میں اس ادارے سے اُردو کا جتنا تحریری میٹریل نشر ہوتا تھا وہ پہلے ایک مستند ماہرِ زبان کی نظر سے گزارا جاتا تھا۔ بغیر زبان کی غلطیاں یا خامیاں درست ہوتے کوئی تقریر نشر نہیں ہوتی تھی۔ مجنوں صاحب ریڈیو میں اس کام پر مامور تھے اور تقسیم کے بعد وہ اسی عہدے سے ریڈیو پاکستان کراچی سے ریٹائر ہوئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ریڈیو سے ان کے چلے جانے کے بعد یہ جگہ ختم کر دی گئی اور اب نہ وہاں نہ ٹی وی پر کسی کو زبان کی فکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن اداروں میں جو جس کے منہ میں آتا ہے بولتا چلا جاتا ہے۔ کلام بے لگام[2] شاید اسی کو کہتے ہیں۔

---

[1] اس زمانے میں نیاز صاحب بھی ایسی شاعری کرتے تھے:-

ع جو اُٹھے تو اک تماشا، نہ اُٹھے تو اک کہانی!

اور میرے علی گڑھ کے زمانے میں یلدرم نے ترکی سے ترجمہ کیا تھا:-

ع ہائے ہے کس کے لئے اُس جسمِ عریاں کی بہار

[2] اصل لفظ "لجام" ہے۔

اُن کی بیگم صاحبہ جوانی ہی میں فوت ہو گئی تھیں۔ وہ چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے مگر انھیں اپنے بیٹے حسن اور بیٹی نرجس سے اتنی محبت تھی کہ بقیہ عمر ان دونوں کی تعلیم و نگہداشت ہی میں گزار دی۔ خدا کے فضل اور اپنی نیک نیتی کے طفیل دونوں کو دینوی اعتبار سے نہایت خوشحال بنا دیا۔ صاحبزادے حکومتِ پاکستان کے ایک نہایت معزز عہدے سے ریٹائر ہوتے اور صاحبزادی ایک اعلیٰ عہدے دار کی بیگم بنیں۔ اس اثنا میں انھوں نے اپنا علمی و ادبی کام جاری رکھا۔ جناح کالج میں کچھ عرصے شوقیہ اُردو کے اُستاد بھی رہے۔

کراچی میں وہ ابتدا میں پیر الٰہی بخش کالونی میں مقیم ہوئے۔ بعد میں ناظم آباد میں ایک خاصا وسیع خوش قطعہ دو منزلہ مکان تعمیر کرا لیا تھا۔ نیچے کا حصہ کرایے پر دے رکھا تھا۔ اوپر کے حصے میں بڑے سلیقے سے تنہا رہتے تھے۔ کچھ دن صاحبزادے کے ساتھ سابق مشرقی پاکستان میں بھی رہے۔ سبزہ اور دریاؤں کی یہ سرزمین انھیں اس قدر پسند تھی کہ بھوایک بدنگا لن کو بنایا۔ اس علاقے کی تعریف میں وہاں کے دورانِ قیام میں لکھی ہوئی نظمیں پہلے متفرق طور پر "ماہ نو" میں شائع ہوئیں۔ وہاں سے کراچی واپس آنے کے بعد ان کا مجموعہ راس مسعود سوسائٹی کی طرف سے "مشرقِ تاباں"[۱] کے نام سے شائع کرایا اور مجھ سے اس پر بہ اصرار ابتدائیہ لکھوایا۔ اس کے بعد ان کی "نائی : شخصیت اور حسنِ بیان"[۲] بھی میری ابتدائی سطور کے ساتھ سوسائٹی مذکور کی طرف سے شائع ہوئی۔ جب اُن کے صاحبزادے مشرقی پاکستان سے تبدیل ہو کر کراچی آئے تو مخمور صاحب نے اپنے نئے مکان کی بالائی منزل کا صرف ایک کمرہ رکھ لیا باقی حصہ بیٹے بہو اور پوتے کو رہنے کے لیے دے دیا۔

افسوس کہ یہ انتظام انھیں راس نہ آیا۔ میں ان دنوں اپنے شمالی ناظم آباد کے حسین ڈی سلوا ٹاؤن والے مکان میں رہتا تھا اور وہ کبھی کبھی

۱؎ یہ خوبصورت نام مشفق خواجہ نے تجویز کیا تھا۔

۲؎ یہ نام بھی مشفق خواجہ صاحب کے حسنِ ذوق کا آئینہ دار ہے۔

میرے پاس آجایا کرتے تھے۔ اگر نہ آتے تو ہمارے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ میری بیوی اور بچوں سے خوب مانوس ہوگئے تھے اور ہمارے گھریلو معاملات اور باتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ہمارے ہاں اُن کا خوب جی لگتا تھا۔ وہ ہم سب کے ساتھ بالکل مخلی بالطبع ہوکر بات چیت کرتے تھے۔ کئی بار ہم لوگ اُن کے ہاں جاچکے تھے۔ اُنھیں باغبانی کا بڑا شوق تھا اور پھول پتیوں کے اقسام اور ان کی پرورش سے کافی واقفیت تھی۔ اپنے گھر کی اوپر کی منزل میں بھی اُنھوں نے ایک چھوٹا سا قطعہ تازہ پھولوں کے گملوں سے سجا رکھا تھا۔ اس معاملے میں کئی بار انھوں نے میری بیوی کی رہنمائی اور امداد کی جنھیں اپنا باغ سجانے کا ہمیشہ شوق رہا۔

کچھ دن بعد معلوم ہوا اُنھیں اپنے گھر میں آرام نہیں ہے اور اس حد تک کہ کئی بار بڑی بے تابی کے ساتھ اُنھوں نے مجھ سے میرے مکان میں ایک علیحدہ کمرہ اپنے رہنے کے لیے مانگا۔ یہ داستان بڑی دل خراش بلکہ روح فرسا ہے اگرچہ یہ واقعہ بھی ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ معیار زبان وادب، نفاست مزاج اور نزاکت طبع کے باعث زود رنج واقع ہوئے تھے۔ وہ ایک حساس شاعر اور فن کار تھے اور ظاہر ہے کہ ان کے خیالات اور مطالبات کا ہر وقت پورا پورا ساتھ دینا گھر والوں کے لیے ذرا مشکل ہی تھا۔ طرّہ یہ کہ صاحبزادے صاحب کا رویہ ہزار سعادت مندی کے باوجود کچھ اُن کے خلاف ہوگیا۔ سچ پوچھیے تو شادی کے بعد کسی بھی بیٹے کے لیے بیوی اور ماں باپ دونوں کی ادائی حقوق کے درمیان اعتدال قائم رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ اس پل صراط کو پار کرنا تائید ایزدی اور بے انتہا ہوشمندی کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔

افسوس کہ میں اپنے ہاں اُن کے قیام کے معاملے میں ان کی امداد سے قاصر رہا۔ اس لیے کہ کثیر العیال تھا اور کھانے اور ملاقات کے ہال کے علاوہ تین کمروں کا مکان میرے لیے خود تنگ تھا۔ بالآخر وہ پہلی چورنگی ناظم آباد میں اپنے ایک عزیز کے پاس کچھ دن کے لیے منتقل ہوگئے اور وہاں سے مجھ سے خط وکتابت کرتے رہے پھر اپنے ایک اور دوست کے گھر میرے مکان سے کچھ ہی فاصلے پر رہنے کے لیے چلے آئے۔ قرب کی وجہ سے میرے پاس اُن کی آمد پھر ہونے لگی اور اگرچہ وہ اپنا غم غلط کرنے

کے لیے علم و ادب و سیاست نیز اپنی قدیم مجلسی زندگی کی باتیں کرتے تھے مگر ان کی روح کی بیقراری چھپائے نہ چھپتی تھی۔ وہ خیرپور میں اپنے ایک عزیز کا بہت ذکر کرنے لگے اور اس ابتدا کا انجام یہ ہوا کہ ایک دن میرے پاس اُن کا خط آیا کہ وہ بقیہ زندگی کراچی سے باہر گزارنے کے لیے اپنے اسی عزیز کے پاس چلے آئے ہیں۔ اس کے بعد تو وہاں سے اُن کے خطوط کا تانتا بندھ گیا اور اُن میں سے بعض میں اُن عزیز کی تعریف و توصیف اور اُن کے گھر میں اپنی دیکھ بھال اور خدمت گزاری کے قصیدوں کے علاوہ کم کوئی اور مضمون ہوتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف ایک بار ان کی بیماری کے زمانے میں مختصر ترین عرصہ کے سوا ان کے صاحبزادے وہاں اُن کی موت واقع ہوجانے کے بعد ہی پہنچے۔ ابوالاثر حفیظ کا یہ شعر ؎

آہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اُتارنے
غفلت ذرا نہ کی مرے غفلت شعار نے!

اُن پر کس قدر صادق آتا ہے۔ موت تو وقت پر آتی ہے۔

ع موت کا ایک دن معین ہے! (غالب)

پھر بھی کہتے یہی ہیں کہ موت قبل از وقت آئی مگر محمور صاحب اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے کم و بیش اسّی برس سرد و گرم زمانہ کا مزہ چکھ چکے تھے[1]۔ ہاں موت کا ایک بہانہ ضرور ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے، اُن کی موت کا بڑا سبب ان کا یہی خانگی معاملہ تھا، مگر شاید ایک دوسرا سبب بھی تھا جو کم حسرت ناک اور عبرت انگیز نہیں۔ یہ ان کے ایک نایاب علمی کارنامے کی عدم اشاعت ہے۔ شاید اس کے لیے محض "بہ قدرِ سدِّ رمق"[2] میں بھی ذمہ دار ہوں اور اگر ایسا ہے تو میں ان کی روح سے شرمندہ ہوں۔ اپنا ایک پرانا شعر زبان پر آگیا ؎

حال میری بیکسی کا میرے بعد
کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

---

[1] محمور صاحب نے اپنی موت سے پہلے لکھا: "میں بہت بوڑھا ہوچکا ہوں۔ چراغِ سحری ہوں۔ ساتویں فروری ۷۵ء تک زندہ رہا تو اٹھتر (۷۸) پورے کروں گا۔ بدن کا تھکا مسافر خدا جانے کس روز روح کا بوجھ سر سے اتار پھینکے"۔

[2] حسرتؔ، وصل میں بھی غذائے روح رہا دردِ فرقت بہ قدرِ سدِّ رمق

مگر میں بغیر پوچھے عرض کرتا ہوں۔

انجمن ترقی اُردو نے جس سے مرکزی حکومت کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں سولہ سترہ سال متعلق رہا، ان کی ایک کتاب موسومہ "غالب کی فطنت اور صناعت کا مطالعہ" چھاپنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ میں اور مشفق خواجہ ایک دن اس کا مسودہ ان سے لے آئے۔ اس کام میں میرا حصہ بس اتنا ہی تھا۔ کیونکہ اشاعتی شعبہ مجھ سے متعلق نہ تھا۔ میں شعبۂ لغات سے متعلق تھا۔ اس میں شبہ نہیں یہ محمود صاحب کی لاجواب تصنیف تھی جس پر انھیں بڑا ناز تھا۔[1] مالک رام اس کی فہرستِ مضامین اور ڈاکٹر ممتاز حسن اس کے کچھ حصے دیکھ چکے تھے۔ دونوں نے ان کی جگر کاوی کی دل کھول کر داد دی تھی۔ چند ابواب خواجہ صاحب نے ازراہِ تعارف" اردو

۱؎ محمود صاحب کے الفاظ میں "صد سالہ برسی کے موقعے پر ہندوستان، یوروپ، پاکستان میں غالب پر چند در چند کتابیں لکھی گئیں مگر ان میں کوئی تصنیف شاعر کی فکر سے متعلق نہیں۔ رالف رسل کی تصنیف، حیات اور خطوط سے متعلق ہے۔ مالک رام کی تصنیف، حیات اور تصانیفِ نثر سے متعلق ہے۔ ظ۔ ا۔ انصاری کی تصنیف سرسری اور سطحی ہے۔ پاکستان میں اب تک فکر پر کوئی جامع تصنیف نہیں ہے جس میں معاشرے، ماحول، عہد سے بھی سروکار رکھا گیا ہو۔ بہر نوع میری نظر سے ہنوز کوئی ایسی تصنیف نہیں گزری جو مفصل، تفسیری، تعمیری، جامع ہو۔"

مزید "مشہور مبصرین ادب والٹر پیٹر، آسکر وائلڈ، الیٹ کے جدید ترین نظریاتِ تنقید کے انداز پر بحث جگہ جگہ تفسیری اور تعمیری ہے۔ مشہور پروفیسر ڈاؤڈن اس وقت شیکسپیر کے موضوع پر مبصرِ اعظم اور حرفِ آخر سمجھے جاتے ہیں۔ ان ہی کی پیروی میں اس تصنیف میں تجزیاتی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ قصیدے پر کتاب کے اکیسویں باب میں یہ بحث ہے کہ غالب کے قصیدے کا فن اور مغلیہ شاہ جہانی تعمیرات (تاج، موتی مسجد، جامع مسجد دلی) کا فن ایک ہی نوعیت کا ہے۔ یہ بالکل نئی بات ہے۔"

سہ ماہی" میں بیشتر بھی شائع کیے۔ مگر دقت یہ تھی کہ مسودہ اس قدر ضخیم اور طویل تھا کہ کتاب کا فوری طور پر (جیسا کہ محمود صاحب چاہتے تھے) ایک جلد میں شائع ہونا ممکن نہ تھا اور دو تین جلدوں میں چھپوانا انھیں منظور نہ تھا۔ انجمن کے پاس بہت پہلے کے منظور شدہ مسودات چھپنے کو پڑے تھے۔ انھیں دنوں انجمن پریس کی توسیع و ترقی کا پروگرام بھی زیر عمل تھا۔ کوئی تین نئی مشینیں درآمد ہوئی تھیں اور انجمن مقروض تھی۔ سرکاری گرانٹ میں کٹوتی شروع ہوگئی تھی۔ پھر کتاب کی طباعت، کتابت، تشکیل و ترتیب وغیرہ کے بارے میں محمود صاحب کے اپنے خیالات تھے اور وہ نہ صرف اُن سے سرمو تجاوز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ کم و بیش ہر روز نئی سی نئی تجویزیں اضافہ کرتے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کسی حد تک کیا بھی گیا کہ "اردو سہ ماہی" کے مطبوعہ اجزا کے فالتو اوراق صفحات کے علیحدہ نمبر دے کر نکلوا لیے جاتے اور وقت آنے پر الگ ٹائٹل چھپوا کر کتاب شائع کر دی جاتی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئے[۱] اور آخری وقت تک مسودے میں جگہ جگہ اضافوں اور تبدیلیوں کی ہدایت کرتے رہے۔ انجمن کی اپنی مجبوریاں قائم رہیں اور اسی حیص بیص میں کئی سال گزر گئے۔ معاملہ جہاں کا تہاں رہا تا آں کہ ۱۹۷۶ء میں ان کا انتقال پر ملال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

ع اے کمال! افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے! (ذوق)

---

[۱] اس سلسلے میں انھوں نے لکھا "اپنی بری بھلی تحریر بر اعظم کے مقتدر رسائل میں نصف صدی سے چھپتی دیکھ رہا ہوں۔ اب تک یہ طفلانہ ذوق و شوق پورا ہو چکا ہے۔ سہ ماہی میں بہ اقساط چھاپنے کی کریمانہ تجویز سے کئی مرتبہ میری عزت افزائی کی جا چکی ہے مگر یہ بدنصیبی ہے کہ اس سخاوت سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ میں اس تصنیف کی تکا بوٹی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ براہ کرم یہ اقدام نہ فرمائیں۔ اس کا کوئی جزو رسایل میں نہ شائع کیا جائے"۔

شاہ نظام الدین دلگیر

دلگیر اکبر آبادی مرحوم سے میرے علی گڑھ کے دورانِ قیام یعنی ۱۹۲۲ تا ۱۹۳۶ء کے عرصے میں بہ استثنا ۱۹۳۱ تا ۱۹۳۳ء جب میں ایم اے اردو کے طالب علم کی حیثیت سے الٰہ آباد یونیورسٹی میں تھا، مجھے میرے عزیز دوست ہم جماعت خواجہ مسعود علی ذوقی[۱] نے ملایا تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ اُن سے میری بہت اچھی ملاقات ہوگئی۔ ان کا مشہور رسالہ "نقاد" بند ہو چکا تھا۔ اور انھوں نے ۱۹۲۵ء میں جب میں بی اے کا طالب علم اور "علی گڑھ میگزین" (طلباء کے رسالہ) کا نائب مدیر تھا یونیورسٹی کی طلائی جوبلی کے موقع پر مجھے جوش صاحب سے ملایا تھا۔ اس وقت میں نے اس رسالہ کا جوبلی نمبر شائع کیا تھا۔ اُن کے بڑے صاحبزادے انتظام الدین شاہ جمالی بھی وہیں اپنے بھائی کے ساتھ پڑھتے تھے اور ہم دونوں یعنی مجھ سے اور ذوقی سے ہمارے کمروں میں ملنے آتے رہتے تھے۔ دونوں کو شعر و شاعری سے دل چسپی تھی، مگر جونیر ہونے کی وجہ سے لحاظ سے کام لیتے تھے اور جہاں تک یاد ہے انھوں نے ہمیں اپنا کلام کبھی نہیں سنایا۔

شاہ صاحب آگرہ (اکبر آباد) سے وقتاً فوقتاً علی گڑھ آتے رہتے تھے اور اپنے بچوں کے پاس قیام کرتے مگر ہم دونوں کے کمروں میں محفلِ شعر و سخن برپا کرنے ضرور تشریف لاتے تھے۔ بعض دفعہ دن دن بھر ان کا ساتھ رہتا۔ اور کبھی رات کو بھی وہ ہمارے ہاں رہ جاتے۔ ایک بات یہ میں نے

---

[۱] ذوقی صاحب کا تذکرہ میری کئی تحریروں میں آیا ہے۔ مثلاً میرے موجودہ مجموعہ کی پہلی جلد "چند اکابر، چند معاصر" میں کرنل مجید ملک پر مضمون میں نیز انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی "اردو" کے "غالب۔ صدی نمبر" میں میرے مضمون "غالب کا الحاقی کلام۔ ایک داستان" میں۔ بعد فراغ تعلیم وہ جوبلی کالج اعظم گڑھ میں پرنسپل اور آخر میں علی گڑھ کے شعبۂ اُردو میں استاد رہے۔

عجیب دیکھی کہ اگرچہ وہ اپنے وقت کے نامور ادیب اور جانے پہچانے شاعر تھے، نیاز کے ہم جلیس، مہدی افادی کے دل پسند ادیب اور سجاد حیدر یلدرم کے دوست مگر یونیورسٹی کے اہل علم یا اساتذہ میں سے کسی کے ہاں ان کی آمد و رفت نہ تھی۔ ایک آدھ بار میرے ساتھ سجاد صاحب کے پاس تو گئے ورنہ ان کا زیادہ وقت طلبا ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ نہ ان کی کوئی پارٹی یا جتھا تھا جس کے ساتھ وہ گھومتے پھرتے ہوں جیسا کہ سیماب صاحب کا معاملہ تھا جب وہ آگرہ سے علی گڑھ آتے تھے، اگرچہ خاص ہمارے حلقے میں موخر الذکر کا پھیرا برائے نام ہی ہوتا تھا۔

جوش صاحب کی "یادوں کی برات" کے بعض حصوں کے خلاف مجھے بہت کچھ کہنا ہے جہاں انھوں نے حقیقت پر پردہ ڈالا ہے یا غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس کے لیے فرصت چاہیے۔ مگر شاہ دلگیر کی بابت انھوں نے جو لکھا ہے "دراز ریش، دراز دست، کوتاہ ہمت، بخل پسند، پرکیسہ تہی دست... بخوشی مہمان، بہ کراہت میزبان... جیسنوں کی جناب میں پارہ سیماب" تو اس میں شاید "دراز ریش" کے سوا دکیونکہ مجھے یاد آتا ہے کہ ان کی ڈاڑھی مختصر تھی اور ان کے موٹے بھدے اور گول چہرے پر نمایاں نہ تھی) اُن کے باقی تحریر کردہ خصوصیات کم و بیش درست ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ شاہ صاحب اپنی مندرجہ بالا کمزوریوں کے باوجود ایک ایسی دل کش شخصیت تھے کہ اُن سے پیار کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا۔ میں ان کے بارے میں اپنے تجربات لکھتا ہوں اور اقبال کرتا ہوں کہ ان کی کمزوریوں کے پیش نظر بھی مجھے ان سے شدید محبت تھی۔ اس وقت بھی کہ یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں ان کی صحبتیں یاد آتی ہیں اور اگرچہ وہ اب دنیا میں نہیں ہیں، ان سے ملنے کے لیے میرا دل بے چین ہے۔

اُن کا حال یہ تھا کہ اگر صبح کو ہمارے کمرے میں آ گئے تو یہ بالکل بھول جاتے تھے کہ ہمیں درس کے لیے جماعتوں میں بھی جانا ہے۔ شعر و شاعری، حسن و عشق، جمالیات، بالخصوص صنفِ نازک کی ذات، صفات اور نفسیات پر گفتگو ہوتی جو اُن کا دل حسب ترین موضوع تھا۔ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ ہمسائے میں طلباء کو خبر ہو جاتی (اس لیے کہ اُن کی آواز بات دار تھی اور بہت

بے چین ہو کر شعر پڑھتے تھے) تو وہ جمع ہونے شروع ہو جاتے۔ شاہ دلگیر بھاری قد و قامت کے انسان تھے۔ ان کے اعضا موٹے اور بھدّے تھے۔ ان کا بھاری محفل میں بڑے اطمینان سے پسکڑا مار کر بیٹھنا اور اپنی نیز اپنے قریب والے سامعین کی رانوں پر زور زور سے اپنا موٹا ہاتھ مار کر یا کہنی سے ٹھوکے دے کر بلند آوازیں اور داد طلب انداز سے لہک لہک کر یہ مقطع پڑھنا آج بھی یاد ہے ؎

اس طرف اب نہ دیکھنا دلگیر
چشم بد دور، سو کے آئے ہیں

ضمناً ان کا صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا، کبھی سہ پہر کی چائے بھی طلبا کی ذمہ داری ہوتی، اگرچہ سچی بات یہ ہے کہ وہ ان باتوں کے لیے کسی اہتمام کی فرمائش نہ کرتے تھے۔ بعد کے تجربات سے ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ ہم سے ملاقات کرنے سے زیادہ ان مدّات پر اپنا خرچ بچانے کی غرض سے آتے تھے۔ علی گڑھ کی مشہور نمائش کے زمانے میں بارہا ایسا ہوا کہ ہم نے اس خیال سے کہ ہم سے بڑا ہونے کے سبب وہ ہمارے اخراجات برداشت کریں گے ان سے تھیٹر یا کسی اور تماشے میں چلنے کی فرمائش کی مگر وہ فوراً بڑی معصومیت سے فرماتے "ارے بھائی ہمیں کون تھیٹر لے جاتا ہے!" یا "ہمیں کون تماشا دکھاتا ہے!" یہی حال میرٹھ کے بندو خاں مشہور پراٹھے والے (اور کباب بھی) کی دوکان پر چلنے کے سلسلے میں ہوتا[1] وہ حسب معمول فرماتے "ہاں بھئی ہمیں کون پراٹھے کھلاتا ہے!" غرض کہ ہم لوگ ہی ہر موقع پر ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے۔

یہ سب کچھ تھا مگر انھیں میزبان بننے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اور وہ

---

[1] میرٹھ کی نوچندی اور علی گڑھ کی نمائش کی جان، بندو خاں کی دوکان کراچی میں بھی ہے مگر بڑے بندو خان کے بعد اس کے کاروبار کا وہ معیار نہیں رہا اور پراٹھوں کے ساتھ جو اب چھوٹے چھوٹے پرتوں کی شکل میں ہوتے ہیں، چوڑی کڑھائی پر تلے ہوتے بڑے بڑے سپاٹ نہیں ہوتے اور خورجہ کے شلجم کا میٹھا اچار نہ ملنے سے دوکان کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ پھر بھی ایک پرانی یادگار کی حیثیت سے غنیمت ہے۔

آگرہ میں اپنے ہاں آنے کی ہمیں برابر دعوت دیتے رہتے تھے۔ ایک بار ہم چار چھ احباب نے یہ دعوت قبول کر لی۔ (ان کے آبّا نے زرِ دولت کہنا چاہیئے، اس لیے کہ وہ سلسلۂ قادریہ کے سجادہ نشین ہونے کے علاوہ آگرہ شہر کے نہایت آسودہ حال رئیس بھی تھے) واقع میوہ کٹرہ میں کئی دن مہمان رہے۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ انھوں نے ہماری خاطر مدارات نہیں کی مگر وہ کچھ گھبرائے گھبرائے اور غیر حاضر سے رہے اور ہمیں برابر یہ احساس رہا جیسے وہ ہمیں جلد سے جلد رخصت کر دینے کے متمنی ہیں۔ یہ شبہ بھی ہوا کہ شاید ان کی بیگم صاحبہ ان کے ساتھ خاطر خواہ تعاون نہیں کر رہی ہیں۔

علی گڑھ کی نمائش ہی میں اُن کی اس خصوصیت کا بھی تجربہ ہوا جس کے پیش نظر جوش صاحب نے اپنے متذکرہ بیان میں انھیں "حسینوں کی جناب میں پارۂ سیماب" کہا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ بارہ بارہ ایک ایک بجے رات تک نمائش کی دوکانوں پر بلکہ گوشہ گوشہ میں بجلی کے قمقموں کے درمیان یا کشادہ اور عام راستوں پر روشنی کے سیلاب میں حسین چہروں کے تعاقب میں وہ ہم کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے پکڑ کر کشاں کشاں لیے ایک بے تابی کے عالم میں ہر طرف بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ جہاں کہیں حسن نظر آیا انھوں نے صلِّ علیٰ، صلِّ علیٰ کا نعرۂ مستانہ لگایا اور اس کے پیچھے ہو لیے۔ جیسا اوپر لکھ چکا ہوں وہ عمر میں ہم سے بڑے تھے۔ مگر انھیں اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ جوش کے الفاظ میں وہ "خاندانِ مشائخ کے چشم و چراغ تھے" اس لیے میں سمجھتا ہوں یہ ممکن ہے کہ انھیں مجاز میں حقیقت یا کثرت میں وحدت کی تلاش ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ اپنے ہم جیسے ناتجربہ کار اور نوجوان نیاز مندوں کو انھوں نے اپنی اس عادت کی وجہ سے عرصہ تک تباہ حال رکھا اور کئی بار بڑے خطرات سے دوچار کیا۔[۱]

---

[۱] دلگیر صاحب کے چھوٹے صاحبزادے جو کبھی پاکستان ریڈیو میں ملازم تھے مجھے ۱۹۷۸ء میں لندن میں ملے اور شکایت کی کہ میں نے ان کے والد

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس سلسلے میں ایک دل چسپ کڑی ان کی نزاکت خیال یعنی حسن و عشق کے قصوں میں سادہ اور معمولی الفاظ سے موقعے کے لحاظ سے اپنے مفید مطلب اور حسین معنی نکال لینا ان کی خصوصیت تھی۔ نمائش کے دوران ایک دوست نے شاہ صاحب کی ایما پر ایک حجر مٹ کا تعاقب کر کے کسی طرح معلوم کیا کہ اس کا تعلق ایک حکیم خانوادے سے ہے۔ آپ نے مشورہ دیا کہ کسی بیماری کے بہانے حکیم صاحب سے رابطہ قائم کیا جائے اور جب نسخے میں ترکیب استعمال کے ذیل میں "ممزوج کردہ جوشاندہ صاف نہادہ بنوشند" لکھا دیکھا تو الفاظ "ممزوج کردہ" پڑھ کر پھڑک گئے اور انھیں ایک نیک فال قرار دے کر ہمارے دوست کو بہت مبارکباد دی۔ مہدی حسن افادی الاقتصادی نے خان بہادر میر ناصر علی اڈیٹر "صلائے عام" کو ایک خط میں لکھا تھا۔ "میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں" یہ فقرہ دلگیر پر بھی کسی طرح کم صادق نہیں آتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بھی مہدی افادی کو میر صاحب سے کچھ کم عزیز نہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسن و عشق دلگیر کی زبردست کمزوری تھی اور اسی لیے وہ بڑی آسانی سے مشہور قمر زمانی کی فرضی داستان کا مرکزی کردار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

محترم کو ان کے مرنے کے بعد بری طرح اور سر بازار رسوا کیا ہے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ مجھ سے پہلے تو ان کا استہزائی انداز میں تذکرہ جوش صاحب نے اپنی "یادوں کی برات" میں کیا ہے۔ پہلے آپ کو اس کا نوٹس لینا چاہیے۔ مجھے تو اسی نے ہمت دلائی کہ ان کی کھینچی ہوئی تصویر کے علاوہ ان کے والد کی تصویر کا جو ایک دوسرا رخ ہے اسے بھی سامنے لاؤں کیوں کہ وہ ان کے دوستوں کو پیار کے ساتھ ان کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ دو دوستوں کے تعلقات کا معاملہ ہے انھیں اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ کوئی شخص اپنے دوست کو اس کے مضحک پہلوؤں کی وجہ سے بھی پیار کے ساتھ یاد کر سکتا ہے۔

بن گئے۔ یہ زیادتی ان کے ساتھ ان کے بعض دوستوں بشمول نیاز نے کی تھی جنھیں ایک ممتاز ادبی شخصیت بنانے میں شاہ دلگیر نے اپنے رسالے "نقاد" کے ذریعے بڑا اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ محمود رضوی مرحوم نے اپنی وفات حسرت آیات سے کچھ دن قبل مجھے لکھا تھا۔ "نیاز صاحب ایک قطعی گمنام اور بدنام انسان تھے۔ بدنامی کی شان نزول بھی آپ کو معلوم نہیں۔ یہ دلگیر صاحب ہی تھے جو انھیں منصۂ شہود پر لائے اور جنھوں نے ایک بڑے انشاء پرداز اور ادیب کی حیثیت سے انھیں دنیا سے روشناس کرایا۔"

قمر زمانی کے واقعے پر محمود صاحب کا تبصرہ یہ تھا:۔ "میری نظر میں یہ پورا ڈراما ہی ایک طفلانہ حرکت ہے۔ اور غیر مخلصانہ عمل۔ جب دلگیر صاحب مرحوم سے تعلقات تھے اور اتنے گہرے تو گیا ان کی ایک کمزوری پکڑ کر ان کو اس طرح بنانا اور مرنے کے بعد بھی رسوا کرنا غیر مخلصانہ اور غیر شریفانہ حرکت نہیں اور پھر ان کی طرف سے جو رات دن ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھے۔"

قمر زمانی ایک فرضی خاتون تھیں جن کے عاشقانہ بلکہ مضطربانہ اور ادیبانہ خطوط دلگیر صاحب کے پاس آنے لگے۔ وہ "سادہ دل" [1] ان پر مبتلا ہو گئے تھے۔ یاروں نے ان دونوں کے درمیان پردہ ڈال کر ملاقات کرائی تھی۔ یہ حال بھی محمود صاحب کے الفاظ میں سنیئے:

"ضیائی [2] کے کزن محمد احمد (غالباً مرحوم) برقع اوڑھ کر قمر زمانی بنے تھے۔ دلی میں ایک کرایے کے مکان میں ملاقات کرائی گئی تھی۔ اہتمام ضیائی سے اور لطیف [3] نے کیا تھا۔ نیاز صاحب بھی موقع پر تھے اور غالباً بیدل شاہجہانپوری بھی۔ کوٹھڑیوں میں چھپے رہے تھے۔ ملاقات کے واقعے کے بعد مفصل مراسلت شروع ہوئی جو "نقاد" کے دوسرے دور میں آپ نے پڑھی۔ جن خطوط کے عکس شائع

---

[1] حالی سے

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا!

[2] ادبی دنیا کے ل۔ احمد
[3] کبھی "مخزن" لاہور کے نامور مدیر رہے تھے۔

ہوئے ہیں وہ سب نیاز کے اُلٹے ہاتھ کی تحریریں ہیں۔ ایک پر پان کا دھبّہ بھی ہے۔

غرض کہ یہ تھے

ع دلگیر میرے پیارے "نقاد" کے ایڈیٹر!

خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

نیاز فتح پوری

خواجہ مسعود علی ذوقی نے جن کا ذکر اس مجموعہ میں میرے شاہ دلگیر والے مضمون میں آچکا ہے مجھے نیاز صاحب سے بھی ملایا تھا جو اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں اُن کے دوست تھے۔ اور جب نیاز صاحب "نگار" کو لکھنؤ لے آئے تو وہاں اُن سے پہلے کے جمے جمائے میرے ایک معروف مہربان وصل بلگرامی مدیر "مرقع" کے ساتھ علی گڑھ کی چھٹیوں میں نیاز صاحب سے ہماری صحبتیں رہتیں۔ یہ ساٹھ ستر برس پہلے کی باتیں ہیں۔ اب میں نواسی برس کی عمر میں نہ جانے کتنے ایسے مرحومین کا نام لیوا ان صحبتوں کی یاد لیے بیٹھا ہوں۔

ع یادگارِ رونقِ محفل تھی (ہے!) پروانے کی خاک

نیاز صاحب کی طبیعت میں میرے تجربے کے مطابق بہت اتار چڑھاؤ تھا اور اُن کے ہم نوا مجھے معاف فرمائیں۔ اُنھوں نے ادب اور معاشرت کے معاملات میں بعض موقعوں پر بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ بہت سے واقعات ہیں جو اُن کے دورِ عروج میں پیش آتے اور جن پر ان سے باز پرس بھی ہوئی مثلاً دوسروں کے ترجموں یا تصانیف کو جزوی طور پر یا بالکلیہ اپنے نام سے شائع کر دینا۔ مذہبی خیالات و معتقدات کے اظہار میں غیر معمولی آزادی یا جراَتِ رندانہ سے کام لینا یا دوسروں کے خانگی اور ذاتی معاملات کو طشت از بام کر دینا یا مزاحاً اپنے دوستوں کو رسوا کر دینا وغیرہ۔ مگر انھوں نے ان اعتراضات کا کوئی نوٹس نہیں لیا[1] اسی کے ساتھ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی "لبرل" طرزِ فکر و تحریر سے اپنے لیے علم و ادب و شعر کی دنیا میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ ان کی ایک اہم ادبی بے راہ روی کا مفصل تذکرہ میں نے اپنے مضمون "غالب کا الحاقی کلام — ایک داستان" میں کیا ہے جس کا حوالہ مجموعۂ ہذا میں شاہ دلگیر والے مضمون کے ایک حاشیہ

---

[1] ان کا کچھ تذکرہ میری "حیاتِ مستعار" کے پہلے حصے میں ملے گا۔

پر ملے گا۔ یعنی انھوں نے آسی لکھنوی کے غالب کے رنگ میں کہے ہوئے اشعار کو غالب سے منسوب کر کے "نگار" میں ایک فرضی حوالہ کے ساتھ شائع کر دیا[۱]۔

اُن کی طبیعت کے اُتار چڑھاؤ کے سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ وہ موقع و محل کے لحاظ سے ہوتا[۲]۔ اپنے ایک خط میں ایک بار اُنھوں نے مجھ پر فقرہ کسا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ... میں کوئی اخبار یا رسالہ کیوں کر خرید سکتا ہوں۔ یہ اس گناہ کی سزا تھی کہ میں نے اپنی ایک کتاب کے ریویو کو دیکھنے کے لیے اُن کا پرچہ مفت طلب کیا تھا۔ حالانکہ اُس زمانے کے ادبی اخلاقیات کی رو سے اُنھیں خود وہ پرچہ مجھے بلا معاوضہ بھیجنا چاہیے تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں جب میں حکومتِ ہند کے انفارمیشن بیورو میں بہ حیثیت اسسٹنٹ انفارمیشن افسر ہندوستانی زبانوں میں سرکاری پبلسٹی کا انچارج تھا اور منجملہ دیگر مواد کے مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے بارے میں مصر و ایران کے عربی و ایرانی رسائل و اخبارات سے بھی منتخب مضامین معاوضہ پر ترجمہ کرا کے اُردو اخبارات کو اشاعت کے لیے بھیجے جاتے تھے[۳]، تو موصوف کی میرے بارے میں کچھ اور

۱ے یہ مضمون نظرِ ثانی شدہ شکل میں اب میرے مجموعۂ "شعر و شعریات" مطبوعہ راس مسعود سوسائٹی کراچی میں ملے گا۔ اس میں وصل صاحب اور نیاز کے تعلقات کے بارے میں بھی کچھ معلومات ملیں گی۔

۲ے اکبر الہ آبادی سے

جیسا موسم ہو مطابق اس کے دیوانہ ہوں میں
مارچ میں بلبل ہوں، جولائی میں پروانہ ہوں میں!

۳ے ضمناً یہ عرض کر دوں کہ اُردو اخبارات میں فیچر کالموں اور معلوماتی ضمیموں کی موجودہ بھرمار کی ابتدا ہمارے آفس اسی قسم کے ثقافتی اور معلوماتی (خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ کے حالات و واقعات کے بارے میں نیز دیگر متنوع مضامین سرکاری طور پر بہ افراط فراہم کرنے سے ہوئی۔ اس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رائے تھی۔ اس وقت انھوں نے مجھے لکھا تھا "اگر آپ اجازت دیں تو "نگار" آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے" تقسیم ملک کے بعد بھی انھیں میرا پاس رہا اور کبھی کبھی میرے کلام کی اپنے پرچہ میں اشاعت کے علاوہ انھوں نے "ماہِ نو" میں میرا مطبوعہ طویل مضمون شاد عظیم آبادی پر میری اجازت کے بغیر "نگار" میں نقل کیا تھا۔ اور میرے ایک مجموعۂ غزلیات کے گرد پوش کے لیے اپنی قیمتی رائے بھی ظاہر کی تھی۔

۱۹۵۱ء میں میرا دوسرا مجموعۂ کلام "نوائے سینہ تاب" کراچی سے شائع ہوا تو میں نے ان سے اپنے کلام کے بارے میں سرورق کے اندر چھپوانے کے لیے مختصر رائے طلب کی۔ انھوں نے یہ عبارت لکھ بھیجی جسے شامل کتاب کیا گیا۔ "حسرت موہانی کے رنگ تغزل کو پسند کرنے والے تو بہت ہیں لیکن اس رنگ میں ڈوب جانے والے خال خال ہیں۔ جناب جلیل قدوائی تنہا ایسے شخص ہیں جو شروع سے آخر تک اس رنگ پر قائم رہے اور اس استقامت کے بعد ان کے کلام میں وہ پختگی پیدا ہوگئی کہ اگر میر سا اختیار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماسبق)

سے پہلے اردو اخبارات میں اس قسم کی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ بلکہ اخبار "انجام" انھیں دنوں عثمان آزاد مرحوم نے جاری کیا تو چھوٹے سائز پر اور عرصہ تک بغیر شذرات کے نکالا۔ انھیں اس طرف توجہ دلائی گئی اور کئی دوسرے مشورے دینے پڑے کیونکہ ہمیں ان سے کام لینا تھا۔ حکومت کی پالیسی تھی کہ اخبارات کے مدیروں کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے مضامین کا ڈھیر لگ جائے تاکہ انھیں اپنی اشاعتیں بروقت نکالنے کے لیے عملے اور مواد کی کمی کی شکایت نہ رہے اور جہاں تک ہو وہ خود روپیہ خرچ کر کے مضامین لکھنے لکھوانے سے بے نیاز ہو جائیں۔ سرکاری مواد کو نمایاں طور پر شائع کرنے یا بہ حیثیت "شذرہ" استعمال کرنے کے لیے انھیں رقوم اور اشتہارات بھی دیے جاتے تھے۔ جنگ کے مدیر میر خلیل الرحمٰن مرحوم کو ایسی بہت سی باتیں خوب یاد تھیں اس سلسلے میں میری تقریر "نشر و اشاعت میں اردو کی اہمیت" مشمولہ "تجزیے اور تجربے" شائع کردہ راس مسعود سوسائٹی ملاحظہ ہو۔

میں ہوتا تو میں بے تکلف جلیل کو حسرت کا جانشین بنا دیتا اور انھیں کراچی
سے کانپور کھینچ لیتا گو اس میں بھی ایک بات ہے کہ حسرت ہندوستان میں
ہوں اور ان کا جانشین پاکستان میں"۔ خط میں لکھا تھا "آئندہ سالنامہ حسرت
نمبر ہوگا، بڑا ظلم ہوگا مجھ پر اور حسرت پر اگر آپ نے کوئی مقالہ مرحمت
نہ فرمایا"۔

مگر عام طور پر وہ دوسروں کے سلوک اپنے ساتھ بھول ہی جاتے
تھے۔ چنانچہ جیسا پہلے عرض کیا گیا معاشرتی تعلقات کے سلسلے میں اُن میں ہمواری
نہ تھی۔ اُس زمانے کے سبھی لوگوں کو معلوم تھا کہ نیاز صاحب کو آگے بڑھانے
میں شاہ دلگیر اکبر آبادی مدیر "نقاد" کا کتنا بڑا ہاتھ تھا مگر اس مخلص مگر سادہ
لوحی کی حد تک پہنچے ہوئے حسن پرست دوست کے ساتھ قمر زمانی کا ڈرامہ کھیل
کر کے نیاز صاحب نے اپنے محسن کے ساتھ نہ صرف انصاف نہیں کیا بلکہ اس
سلسلے میں جو کم سے کم کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طبیعت کی
ناہمواری کا ثبوت دیا۔ پورا ڈراما شاہ دلگیر پر میرے مضمون میں آ چکا ہے۔

ایسی تمام باتوں کے باوجود نیاز صاحب مجھ جیسے کم علم اور کم سواد کی
ہر گرفت سے آزاد اور بلند رہیں گے۔ اور جیسا ابتدا میں عرض کر چکا ہوں علمی
دنیا میں انھوں نے تنہا اتنی مدت تک اس قدر بلند پایہ اور بوقلموں کام کیا ہے
جو ایک مستقل ادارے کے کام سے بھی زیادہ ہے وہ قسمت کے دھنی تھے اور اپنے
مشن میں مخلص، چنانچہ اُردو کی تاریخ میں اس حیثیت کی بہت کم شخصیتیں اُن کے
مقابل لائی جا سکتی ہیں۔

جہاں تک ادب لطیف میں اُن کے ایک صاحبِ طرز اہل قلم ہونے
کا تعلق ہے میں سید سجاد حیدر یلدرم کے بعد اُن سے بہتر کسی کو نہیں سمجھتا حتیٰ
کہ قاضی عبدالغفار کو بھی نہیں کیوں کہ وہ صرف طرز انشا کی بنا پر زندہ نہیں
رہ سکتے۔ اس معاملہ میں نیاز صاحب نے ایک زمانے میں دہرہ دون میں رہ
کر یلدرم کے آگے جہاں وہ ہندوستان میں نظر بند امیر کابل کے اسسٹنٹ
پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے مقیم تھے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ یہ واقعہ
سجاد صاحب نے علی گڑھ میں مجھ سے خود بیان کیا تھا اور اس کا نیاز صاحب
نے (اگرچہ "بھرپور" انداز میں نہیں) "نگار پاکستان" کے نیاز فتحپوری نمبر میں

اتارا بھی گیا ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ اپنی اس اختصاصی حیثیت[1] کو انھوں نے بہت جلد ترک کر دیا ورنہ شاید وہ بلند رم سے بھی بازی لے جاتے۔ نیاز صاحب کی یہ ایک مستقل حیثیت ان کے ٹیگور کی "گلستان جلی" کے مترجم سے بالکل الگ ہے جس کی کورانہ تقلید میں اُردو میں کچھ عرصے تک بے مغز اور لایعنی ادبی عبارتوں کا "ٹگوریت" کے نام سے بازار گرم رہا اور جو طرز تحریر شکر ہے کہ وقت آنے پر اپنی موت آپ مر گئی۔

نیاز صاحب کے مستقل طور پر کراچی آجانے پر ہم نے (یعنی مشفق خواجہ اور راقم نے) انھیں اور جوش صاحب کو ایک سابقہ انجمن ترقی اُردو میں چائے پر مدعو کر کے ان دونوں کی مدتوں کی باہمی مخالفت کے بعد گلے ملوا دیا تھا۔ نادم سیتاپوری کی کراچی میں غالباً پہلی آمد تھی۔ اس موقع پر انھیں بھی زحمت دی تھی[2]۔ اور بیشتر مقامی ادیب اور شعرا شریک بزم تھے۔

یاد ہو گا کہ نیاز صاحب نے "نگار" میں جوش صاحب کے مقابل علی اختر حیدر آبادی صاحب مرحوم کو لا کھڑا کیا تھا۔ اگرچہ اس میں کیا شک ہے کہ مؤخر الذکر بزرگ حضرت جوش سے مقابلے کے علی الرغم خود اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو اُن کی تصنیف "کیوپڈ و سائکی" وغیرہ

[2] یہ بھی مرحوم ہو گئے۔ میرے بڑے مخلص تھے۔ خدا جنت نصیب کرے۔ آمین

رازق الخیری

(۱)

"ایک دن رازق الخیری صاحب آئے تھے۔ نیچے گاڑی ہی میں بیٹھے رہے۔ اوپر نہیں آئے۔ سلام کہتے تھے" یہ میرے بیٹے بختیار سلمہٗ نے اپنے ۲۳ مئی ۱۹۷۸ء کے خط میں مجھے چیسٹر فیلڈ (انگلستان) لکھ کر بھیجا تھا جہاں میں اُن دنوں اپنی بیٹی ڈاکٹر پیر دین کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب میں انگلستان سے کراچی واپس آگیا تو وہ ایک بار پھر آئے اور اس کے بعد بھی جب آنکھوں کا آپریشن کرا چکے تھے مگر چشمہ کا نمبر ابھی نہیں ملا تھا۔ باہر ہی مجھے بلا لیا اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کمزور ہو گئے تھے۔ چہرہ ستّ گیا تھا۔ جسم مرجھا گیا تھا۔ آواز میں وہ کمارا ین نہیں رہا تھا۔ آہستہ آہستہ کہنے لگے "بھائی اب جو دم ہے غنیمت ہے۔ پھر تم کہاں اور ہم کہاں"۔ ہائے! اسی وقت مجھ سے یہ مطلع ہو گیا تھا ؎

غم میں بھی اک لطف ہے اے دوست! ورنہ غم کہاں
چار دن کا ساتھ ہے پھر تم کہاں اور ہم کہاں

غور کیجیے۔ بھلا کہاں شمالی ناظم آباد، اُن کی جائے قیام کہاں وکٹوریہ (اب عبداللہ ہارون) روڈ جہاں اُن کا دفتر تھا اور کہاں گلشن اقبال میری موجودہ جائے اقامت! بلکہ کچھ دن تک ملاقات نہ ہو سکنے کی صورت میں دریافتِ خیریت کے لیے اپنی گاڑی پہ ہو یا کسی دوست یا کرایہ کی سواری پر آنے کے لیے کتنا جتن کرنا پڑتا ہوگا یہ "اہل دل" ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میری طرف ان کا پھیرا ہو جانا لازمی تھا۔ حسین ڈی سلوا ٹاؤن میں تھا تو وہاں بھی اس سے کچھ جلد جلد، اس لیے کہ ان کی جائے قیام اور میری اقامت گاہ کے درمیان فاصلہ نسبتاً کم تھا، واحدی صاحب[1] کے پاس آتے ہوں تو وہاں سے اُٹھ کر یا ان کے پاس جانے سے قبل میرے گھر ان کا آنا ضروری تھا۔

---

[1] اب بریگیڈیر خالد احمد قدوائی۔

باہر ہی سے آواز لگاتے ہوئے "ارے بھئی جلیل صاحب کہاں ہیں؟" اندر داخل ہوتے۔ بیٹھتے کم تھے۔ اور دیر تک بیٹھتے تو بھی بار بار اٹھنے کا ارادہ ظاہر کرتے رہتے۔ میری بیوی، میرے بچوں، میرے دوسرے قریبی عزیزوں اور بعض مشترک دوستوں کی نام بہ نام خیریت پوچھنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ کوئی اور خاطر مدارات ہو یا نہ ہو۔ ایک پیالی چائے اور سگریٹ ان کے لیے ضروری تھیں۔ ڈھیلی ڈھالی لانبی شیروانی (اپنے والد بزرگوار مولانا راشد الخیری کی سی) تیلی مہری کا پاجامہ، سر پر ترکی ٹوپی۔ بیٹھتے وقت ٹوپی اتار دیتے اور رخصت ہوتے وقت بغیر کسی رسمی تکلف کے سر پر ٹوپی رکھ کر کھڑے ہو جاتے اور "لو بھئی۔ اب ہم چلے" السلام علیکم کہہ کر چل دیتے۔ یہ ان کی وضع برسوں کی تھی۔

میری ان کی ملاقات ۱۹۳۶ء میں دہلی میں ہوئی تھی جب میں علی گڑھ سے حکومت ہند کی ملازمت میں چلا گیا تھا۔ وہاں بھی میر درد روڈ، دریا گنج، اور نئی دہلی میں گول ڈاک خانے والی سڑک پر میرے قیام کے دوران میں بھی ان کا میرے ساتھ یہی معاملہ رہا۔

تقسیم سے پہلے سرکاری ملازمت اور پاکستان میں پنشن لینے کے بعد اور پھر انجمن ترقی اردو سے اپنے تعلق کے زمانے میں مجھے ان کے پرچوں میں باقاعدہ لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ فرصت نکالنا ہی دشوار تھا۔ کبھی کبھی چند سطریں میں نے بھیج دی ہوں وہ الگ بات ہے۔ مگر مضمون کے لیے ان کے خطوط برابر آتے اور زبانی بھی اصرار رہتا۔ اور مجھ سے بڑھ کر میری بیوی سے مضمون کا سوال رہتا۔ اپنے خط میں مجھے خاص طور پر لکھتے کہ سرمزی سے کچھ ضرور لکھیں اور برابر لکھتی رہیں اور جب کبھی سرمزی کوئی مضمون لکھ کر بھیج دیتیں تو اسے فوراً چھاپتے اور پھر دوسرے مضمون کا تقاضا کرتے۔ سچ یہ ہے کہ سرمزی کی جو کچھ بھی مضمون نویسی ہے وہ بھائی رازق مرحوم ہی کی حوصلہ افزائی اور اصرار کی رہین منت ہے۔ مضمون کے لیے اصرار کرنا خصوصاً خواتین مضمون نگاروں کی حوصلہ افزائی اور دلداری کی وضع کوئی ایڈیٹر ان سے سیکھتا۔ اپنے اسی پیارے بے تکلف اور دل نواز انداز سے انھوں نے بیسیوں مسلم خواتین کو لکھنے کی ترغیب دی اور ان میں سے متعدد آج صف اوّل کی اہلِ

قلم اور مصنفہ شمار ہوتی ہیں۔

اور سب سے بڑی وضع داری تو اپنے والد اور اردو کے تمام عشاق بلکہ اُردو ادب کے بزرگوار اور مسلم خواتین کے سب سے بڑے دردمند صاحب طرز ادیب مصوّرِ غم حضرت علامہ راشد الخیری کے قدیم پرچے "عصمت" کے ساتھ ان کی نصف صدی سے زائد کی طولانی وابستگی اور اس کی اشاعت میں وقت کی سختی کے ساتھ پابندی تھیں۔ مجال ہے کوئی پرچہ مہینہ کی تیئس ۲۳ تاریخ کو شائع نہ ہو جاتے۔ شاید ہی کسی اشاعت میں کبھی دیر ہوئی ہو۔ درحقیقت غالب کا یہ مشہور مصرعہ اُن پر صادق آتا تھا:

ع وفاداری بشرط استواری عین ایمان ہے!

"عصمت" کے ساتھ بچیوں کے لیے "بنات" اور خواتین کی دستکاری کی تعلیم کے سلسلے میں "جوہر نسواں" یہ دو پرچے مزید نکالے اور ان کے کاموں میں بھی ان کے شغف کا یہی حال تھا۔

دہلی میں تو "عصمت" اور دوسرے پرچوں نیز اُن کے بک ڈپو کا دفتر ان کے گھر ہی پر تھا مگر کراچی میں ابتدائی دور کو چھوڑ کر ان کا دفتر گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ یہاں تک کہ جب سے وہ شمالی ناظم آباد میں رہنے لگے تھے اس وقت سے اُن کا دفتر گھر سے کوئی دس میل دور ہو گیا تھا۔ مگر آندھی آئے، پانی برسے، عمر سے مجبور ہوں، چلنے پھرنے سے معذور ہوں، صحت خراب ہو، روزانہ پابندیٔ وقت سے دفتر پہنچنا اور مسلسل کام کرنا اپنا اہم ترین فریضۂ حیات تصوّر کرتے تھے۔

اس معاملہ میں ہمارے ملک کے سرکاری ملازمین کے لیے ان کی زندگی ایک قابلِ قدر سبق تھی۔ کاتب اور ملازم تکلیف دیں، چپراسی نہ ہوں، کلرک غیر حاضر ہوں، سواری کی دقت ہو مگر انھیں اپنے پرچوں سے عشق تھا، وہ آرام نہ کر سکتے تھے۔ ملازمین کی ساری خامیاں اپنے ذمہ لے لیتے تھے اور معذرت کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو؟ اپنے ابا کے ساتھ پیمانِ وفا جو باندھا تھا کہ ان کے زندگی کے مشن کو ہر حال میں آگے بڑھائیں گے۔ اسے پورا کرنا فرمانِ خداوندی کی تعمیل کے بعد ان کا بڑا فریضہ تھا۔

تقسیم ملک سے پہلے یہ پرچے اور مولانا راشد الخیری کی تصانیف

سارے ہندوستان کے شریف مسلم خاندانوں میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ بھائی رازق نے اس کاروبار کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی۔ مسلم خواتین کی تعلیم و اصلاح اور ان کی مشرقی تہذیبی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے ان کی فلاح و بہبود اور ذہنی آسودگی کا جو مقصد انھوں نے بنایا تھا اس میں یقیناً انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ مگر پاکستان بننے کے بعد ان کے زیادہ تر خریدار ہندوستان میں رہ گئے اور اپنے نئے ملک میں بدقسمتی سے مغربیت کا ایسا زور بندھا گویا پاکستان کی تعمیر ہی اسی لیے ہوئی تھی۔ سستے با تصویر رسالوں کی ایسی بھرمار ہوئی اور نیم عریاں رنگ روپ اتنا نمایاں ہوا کہ ان کے پرچوں کی خریداروں کی تعداد جو پہلے ہی کم ہو گئی تھی اور بھی کم ہو گئی۔

مگر بھائی رازق دھن کے پکے تھے۔ اُن کے حوصلہ اور ارادہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اپنے پرچوں کی ظاہری حیثیت میں بہ قدر مناسب اصلاح کر کے انھوں نے معنوی اعتبار سے اُن کا معیار گرنے نہیں دیا اور اپنے نیک مقصد کو آگے بڑھاتے رہے۔ خود بھی "رسول اکرمؐ کی بیٹیاں" "سیّدہ کی بیٹی" "ابوجہل اور عکرمہ" "مسلمانوں کی مائیں" وغیرہ جیسی کتابیں لکھیں۔ مگر میرے خیال میں ان کا تحریر کردہ "عصمت" کا خاص نمبر جو مولانا راشد الخیری کی سوانح عمری بلکہ دہلی کی قدیم تہذیب کی تاریخ ہے ایک یادگار اشاعت ہے اور اس میں ان کی قلم کاری کے بہترین اوصاف بدرجۂ اتم نمایاں ہیں۔ سادہ رواں، دہلی کا روزمرہ ہے جو انھیں اپنے والد مرحوم سے ورثہ میں ملا تھا اور اسی عام فہم انداز تحریر کی وہ اپنے مضمون نگاروں سے بھی توقع رکھتے تھے۔ ورنہ اپنی اصلاح سے آئے ہوئے مضامین کو اسی رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔

اُن کے کام میں ان کی محترمہ بیگم آمنہ نازلی اور ان کی سعادت مند اولاد نے اُن کا برابر ہاتھ بٹایا اور اس لحاظ سے یہ ایک مثالی خاندان تھا۔ ورنہ آج کل "علم پدر آموز" کی مثالیں حرف غلط کی طرح ختم ہو چکی ہیں۔ لینے

لہ "میراث پدر خواہی، علم پدر آموز" (باپ کی میراث چاہتا ہے تو باپ کا علم سیکھ) پرانی کہاوت ہے۔

پرچوں کی مالی حالت کی بہتری کے لیے انھوں نے راشد الخیری اکادمی قائم کی تھی مگر سچ پوچھیے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ہاں بیوی بچوں کی لگن سے ان کے پرچوں اور مطبوعات کا سلسلہ قائم رہا نیز ان کے ذوقِ ادب کی تسکین ہوتی اور زندگی کو آخر وقت تک تقویت ملتی رہی تو ان رشتہ داروں کے دم سے۔

یہ پرچے اور تصانیف تو خیر یوں سمجھئے کہ ان کی عزیز متاع اور بیش قیمت میراث تھے۔ جن سے وہ قدرتاً اور جذباتی طور پر پوری مستعدی سے منسلک رہے ہیں مگر ملک کے اُردو ادبی رسائل کے بزرگ ترین خدمت گزار بلکہ سرپرست کے بطور انھوں نے ایک کام ایسا کیا جس سے ان رسائل کی مالی حیثیت کم از کم اتنی مضبوط ہو جانے کی اُمید ہو گئی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ سرکاری اور کاروباری اشتہارات کی تقسیم میں اصولاً اور عموماً کثرت اشاعت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے اس لیے کہ سمجھا جاتا ہے جتنی زیادہ اشاعت ہوگی اتنے ہی زیادہ پڑھنے والے ہوں گے اور اسی حساب سے ان کے امکانی خریداروں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اس اصول اور عموم کے مطابق کثیر الاشاعت روزنامے ہی اشتہارات کے مستحق سمجھے جاتے ہیں چنانچہ کثیر الاشاعت روزنامے جو پہلے ہی مال دار ہوتے ہیں اشتہارات کی کمائی سے اور زیادہ مال دار ہوتے رہتے ہیں، اور ادبی رسائل جن کی مالی حالت پہلے سے سقیم ہوتی ہے اس لیے کہ ملک میں علمی ذوق کے زوال کے سبب انھیں خریدار نہیں ملتے اشتہارات کی کمائی سے بھی محروم رہتے ہیں۔

بھائی رازق نے اپنے ذہن رسا اور اثر و رسوخ سے اشتہارات تقسیم کرنے والے حلقوں سے یہ بات منوالی کہ اگرچہ ادبی رسائل کی تعدادِ اشاعت اخبارات کی بہ نسبت کم ہوتی ہے مگر اخبارات کی زندگی چند ساعت کی یعنی صبح یا شام کے زیادہ سے زیادہ ایک یا نصف گھنٹہ کی ہوتی ہے جس کے بعد وہ پڑھ کر پھینک دیئے جاتے ہیں یا ردّی میں فروخت کر دیئے جاتے ہیں، جب کہ رسائل کی جلدیں مرتب کر کے محفوظ کی جاتی ہیں اور باقاعدہ لائبریریوں کی رونق بنتی ہیں اور انھیں بار بار اور سال بہ سال بلکہ ان میں سے بعض کو نسلاً بعد نسلاً پڑھا جاتا ہے۔ اس

لیے رسائل میں شائع شدہ اشتہارات کی زندگی روزانہ اخبارات میں شائع شدہ اشتہارات کی بہ نسبت زیادہ طولانی اور پائیدار ہوتی ہے اور انھیں پڑھنے والے ہر دور میں مل جاتے ہیں اور نامور اور جمے جمائے اداروں کی مصنوعات کا نام زندہ رہتا ہے اور ہر زمانے میں ان کی خریداری ہوتی رہتی ہے۔

چنانچہ ان کی ان تھک کوششوں سے ایک انجمن ادبی رسائل پاکستان قائم ہوئی جس کے بجا طور پر وہ مدت تک صدر رہے۔ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ادبی رسائل کو آسانی سے اشتہارات ملنے لگے۔ جس کی وجہ سے کسی حد تک ان کی مالی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنی اشاعت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کا ایسا احسان ہے جسے پاکستان کے ادبی رسائل ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔

(۲)

برادر معظم[۱] رازق صاحب کی وفات کی خبر مجھے ڈان اخبار سے معلوم ہوئی۔ قدردانی صاحب نے اخبار دیکھ کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہا "لو وہ بھی سدھارے۔ بغیر ملے ہی رخصت ہو گئے۔" میں نے

---

[۱] رازق مرحوم پر یہ مضمون میری عزیز شریک حیات ہرمزی بیگم نے لکھا ہے۔ اسے بھی اپنے مضمون کے ساتھ شامل کرتا ہوں۔ اپنے پہلے مجموعہ "چند اکابر، چند معاصر" میں ان کا ایک مضمون نذر سجاد حیدر مرحومہ پر شامل کیا تھا۔ غرض اس سے دونوں مضمونوں کو محفوظ کرنا تھا ورنہ ادھر اُدھر پڑے رہنے سے ان کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔
نذر سجاد حیدر کے مضمون کو میں نے شخصیات پر اپنے مضامین سے بہتر بتایا تھا۔ یہی ہرمزی کے موجودہ مضمون کی بابت عرض ہے۔ ناظرین پڑھ کر خود فیصلہ کریں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے! (مرتب)

حیرت سے پوچھا۔ "کون رخصت ہو گیا؟" بولے "رازق الخیری چل بسے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتہ فون پر بات ہوئی تھی۔ مضمون بھیجنے کی تاکید کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے مزنی بیگم سے بھی کہو کہ وہ عصمت کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔ غفلت نہ برتیں۔"

میں سناٹے میں رہ گئی۔ میری نظروں میں ان کی چلتی پھرتی تصویر گھوم گئی۔ میرا اخیل مجھے مرحوم کی اور میری جنم بھومی لے گیا۔ جب میری شادی ہوئی تو اکثر ٹہلتے ٹہلاتے چلے آتے تھے۔ نئی دہلی میں ہمارا سرکاری بنگلہ تھا۔ میر درد روڈ پر۔ مرحوم کے اور عزیز بھی ہمارے آس پاس رہتے تھے، شہر سے آ کر کھڑے کھڑے سب ہی کو نمٹا جاتے تھے۔

ہم میاں بیوی کو ان دنوں انگریزی بولنے کا بہت خبط تھا۔ ہم دونوں ہی کو نہیں بلکہ اس زمانے کے جتنے بھی نوجوان تھے سب ہی کو یہ مرض لگ چکا تھا۔ چنانچہ میں بھائی رازق کے سامنے بھی انگریزی میں ان کی باتوں کا جواب دیتی۔ وہ اردو میں بات کرتے اور میں وہی مرغے کی ایک ٹانگ انگریزی جھاڑتی رہتی۔

اس طرح کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ہمارے گھر پر تشریف لاتے رہے۔ ایک دن جب تشریف لائے ترکی ٹوپی کالے پھندنے والی کالی شیروانی، تنگ موری کا تنگ پائجامہ اور خوبصورت سی چھڑی ہاتھ میں تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں لان میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ قدوائی صاحب اور میں بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نوکر کچھ مشروبات لے آیا اور درمیان کی میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میز پر ایک خوبصورت جھالر کا میز پوش پڑا تھا جو نہایت صاف تھا۔ میں نے کہا لیجیے بھائی صاحب شربت پیجیے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور میز پوش کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف پھر گھر کے در و دیوار پر نظر ڈالی۔ باغ کے پھول پودے اور کیاریوں کی وضع قطع کا جائزہ لیا۔ اور پھر میری طرف اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

میں کچھ خوف زدہ سی ہو گئی مگر سمٹی سمٹائی اپنی کرسی پر ساکت بیٹھی رہی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ دل ہی دل میں ایک لمحہ نہیں نہ جانے کتنے وہم گزر گئے۔ خدا جانے گلاس گندا ہے یا میز کا کپڑا میلا نظر آیا انھیں۔ یا مجھ میں

کوئی عیب دکھائی دے رہا ہے۔

انھوں نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا، خاموشی سے گلاس اٹھایا۔ دو ایک گھونٹ پیئے۔ پھر مسکراتے ہوتے بولے "میں اپنے بھائی (جلیل صاحب) کو دیکھ رہا ہوں۔ ان کے خوشنما باغ کو دیکھ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کس کو داد دوں اپنے بھائی کی پسند کو یا آپ کے ذوق اور سلیقہ کو"۔

جب میں نے ان کے یہ کلمات سنے تو میری جان میں جان آئی اور میں نے خوش ہوتے ہوئے بے ساختہ جواب میں "تھینک یو" کہہ دیا۔ "میرا تھینک یو" کہنا تھا کہ فوراً کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے جیسے میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی ہو۔ "بس اب ہم چل دیے"۔ قدوائی صاحب حیران۔ کہنے لگے "اچانک کیوں اٹھ کھڑے ہوتے؟" مگر وہ منہ پھیر کر فرمانے لگے "منہ کا مزہ بگاڑ دیا"۔ میں پھر بھی الوؤں کی طرح کچھ نہ سمجھتے ہوئے تیزی سے بولی "از ایٹ ٹو سویٹ (کیا شربت بہت میٹھا ہے)"۔

ہنسی روکتے ہوتے بھائی صاحب کہنے لگے "اماں چھوڑو یار۔ اب تو اور بھی نہیں بیٹھوں گا"۔ جلیل صاحب نے پریشان ہو کر وجہ پوچھی تو کہنے لگے "تمہاری بیگم میں ساری خوبیاں اللہ تعالیٰ نے کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ بس ایک کمی رہنے دی ہے۔ وہ یہ کہ ان سے ان کی زبان لے لی ہے۔ اچھا بس تو اب میں جا رہا ہوں۔"

میں بہت شرمندہ ہوئی۔ میں نے کہا "دیکھئے میں اب سے انگریزی نہیں بولوں گی۔ آپ بیٹھئے اس طرح نہیں جائیں گے آپ شربت ختم کر کے جائیں"۔ یہ سنتے ہی فوراً زور کا قہقہہ لگایا اور بڑی خوشی سے دوبارہ جم کر بیٹھ گئے۔

اس وقت وہ شاید چالیس برس کے لگ بھگ ہوں گے مگر مجھے تو وہ کچھ بزرگ سے لگتے تھے اس لیے کہ قدوائی صاحب انھیں اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے۔

ایسی ملاقاتیں بہت رہیں۔ پاکستان بن گیا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہم لوگ لاہور رہے۔ دلی تو اسی وقت سے چھوٹ چکا تھا۔ مگر ایک بار ہم پھر گئے تھے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گئے۔ کئی ہوٹلوں میں ہمارا قیام رہا۔ اس

لیے کہ سرکاری مکان ناپید تھا۔ مرحوم کوئٹہ چلا تو ہوٹلوں میں بھی آتے رہے اور اُسی طرح میری انگریزی کی زبان بندی کرتے رہے۔ ایک بار پاکستان میں ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ میں نے اُن سے اپنی باتوں میں اُردو کے ساتھ دس انگریزی لفظ ملائے۔ پھر بھی میں تسلیم کرتی ہوں کہ مجھ میں وہ عیب اب تک باقی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ لکھنے میں یہ بات نہیں۔

میرے قلم میں اُردو لکھنے کی طاقت بھائی رازق کی ہی حوصلہ افزائی سے پیدا ہوئی۔ قلم اٹھانا تو ہر پڑھنے لکھنے والے کو آتا ہے لیکن حوصلہ دلانے سے قلم بے باکی سے چلانا آجاتا ہے۔ مستقل طور پر میری چھوٹی چھوٹی کہانیاں اصرار کر کے مجھ سے منگواتے اور اپنے رسالہ "بنات" میں چھاپتے۔ میری پہلی کہانی "رنگ برنگے موتی" تھی جو انھوں نے چھاپی اور اس کے بعد سے "عصمت"، "بنات"، "جوہر نسواں" میں میرے مضامین چھپتے رہے۔ ابتدائی دنوں کا ایک مضمون میرا عصمت میں چھپا تھا: "ہم کیسی بیویاں ہیں" بہت مقبول ہوا تھا اب ناپید ہے۔ کم از کم مجھے بڑی تلاش کے باوجود ایک نقل بھی اس کی نہ مل سکی۔

یہ بتادوں کہ میری شادی ہوئی تو میں صرف میٹرک پاس تھی۔ شادی کے بعد میں نے انٹر، بی اے اور ایم اے کیا۔ جس میں جلیل صاحب کا دلی تعاون شامل رہا۔

حسین ڈی سلوا ٹاؤن کی میری کوٹھی پر ایک روز وہ تشریف لائے۔ واحدی صاحب مرحوم کے ملنے کے بعد وہ ہم لوگوں کی خیریت لینے بھی آجاتے تھے۔ میں نے حسب دستور ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور باتیں شروع ہوگئیں۔

ان ہی دنوں میرے منجھلے بیٹے خالد احمد نے کاکول ملٹری اکیڈمی سے اپنی ڈگری کے علاوہ بہترین کیڈٹ ہونے پر اس سال کے سارے ہی اعزازات حاصل کیے تھے۔ یعنی شمشیر اعزازیہ، صدر کا طلائی تمغہ، آرٹلری کا چاندی کا تمغہ، بہترین داؤں چلانے کا انعام چاندی کی ایک تختی، اور ایک سرٹیفکیٹ آف میرٹ معہ ڈھائی سو روپے نقد کی رقم۔ ہر طرف سے مبارک بادیں آرہی تھیں۔ اس کی بڑی تین بہنیں ڈاکٹر بن چکی تھیں۔ اور سب ہی نے درجہ اول میں امتحان پاس کیے اور انعامات اور وظائف حاصل کیے تھے، جن میں سے ایک نے جس کے فوراً

لبد کے خالد میاں ہیں، کراچی میں انٹر سائنس میں اول درجہ اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس نے بھی سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔

غرضیکہ میرے بچوں کی نمایاں کامیابیاں مرحوم کے ہی سامنے کیا ہر ایک کے سامنے تھیں اور ہر شخص یہ ہی کہتا تھا کہ جن بچوں کی ماں اتنی قابل ہو بچے آپ سے آپ قابل ہوں گے۔ قدوائی صاحب نے بھائی رازق کو بچے کے انعامات الماری میں سے لا کر دکھانے شروع کئے۔ اپنی بچوں کی کامیابیاں اور خوبیاں گنوانا شروع کیں۔ تو مرحوم بڑے غور سے ان کی باتیں سنتے اور ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ کہتے رہے۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ سب ان کی بدولت ہے جس ماں میں خود سب صلاحیتیں موجود ہوں اس کی اولاد قابل کیوں نہ ہو گی!"۔

پھر قدوائی صاحب کو مخاطب کر کے بولے "میاں تم بتاؤ۔ تم نے کیا خدمات انجام دیں!" اس سے پہلے کہ قدوائی صاحب ان کی بات کا جواب دیتے میں بول اٹھی "! انھیں تو یہ بھی نہیں معلوم رہتا کہ ان کے بچے کون کون سی جماعتوں میں ہیں اور کس وقت اسکول اور کالج جاتے ہیں اور کیا کیا ان کی ضروریات ہوتی ہیں۔ ان کو تو بس دفتر جانا اور اس سے پہلے اخبار پڑھتے رہنا۔ شام کو دفتر سے واپس آنا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد لان میں ہم سب کے ساتھ ٹی وی دیکھنا۔ کھانے کے بعد رات گئے تک پڑھنا لکھنا یہی کام ہیں"۔ میری بات کاٹتے ہوئے جلیل صاحب بولے "جی نہیں، میں نے تو بس ان کو دلہن (یعنی مجھے) اولاد سے بھی بڑھ کر پڑھا دیا، یہ کافی ہے۔ راتوں کو لے لے کر پڑھانے بیٹھا اور ان پر نیند سوار رہی۔ کتاب چھوڑ کر چل دیں۔ میں نے جھڑکیاں کھائی ہیں، سونے کیوں نہیں دیتے۔ لاہور سے امتحان دلانے علی گڑھ لے جاتا تھا۔ پاکستان آیا تو بی اے کرایا۔ ایم اے کرایا اور اب یہ ماشاءاللہ اس قابل ہو گئی کہ نہ صرف میرے بچوں کو بلکہ اکثر مجھے بھی پڑھاتی ہیں!"۔

مرحوم مسکرا مسکرا کر ان کی باتیں سنتے رہے پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں!! "یہ تو سب کچھ درست ہے جو تم نے کہا۔ مگر اس بات کا جواب دو۔ (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ پڑھنے والی نہ ہوتیں تو کس کو پڑھاتے؟"

شکر کرو کہ تمہاری زندگی بنادی۔ انھوں نے تمہاری اولاد کو مثالی شخصیتیں بنا کر تمہارے حوالے کر دیا ورنہ تم تو صرف قلم کے دھنی ہو۔ دنیا سنبھالنا نہیں جانتے۔ میں کہتا ہوں ایسی بیوی کے تو پاؤں دھو دھو کر پینا چاہیئے۔"

قدوائی صاحب نے کہا "یہ سب تو میں مذاق میں کہہ رہا تھا۔ ان کی خوبیوں میں کیا شک ہے۔ پھر ہنس کر بولے "میں نے ان کے پاؤں بھی دھوئے ہیں، تم ان سے پوچھ لو ہاں میں نے دھوون پیا نہیں"۔

رازق بھائی نے جو میری تعریفیں کی تھیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر پھر وہی، انگریزی میں "تھینک یو" کہہ دیا بلکہ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولے: "دیکھئے پھر اپنے وعدے سے پھر گئیں آپ! وہی انگریزی"۔ میں نے شرمندگی سے کہا اچھا "سوری سوری"۔ اس پر تو کھڑے ہی ہو گئے اور کہا "اچھا تم نہیں مانتیں تو ہم جاتے ہیں"۔ اور بہت خفا ہوئے۔ میں نے انھیں منا لیا۔ اور کہا "دیکھئے" وہ چائے آ گئی۔ اب میں آپ کو اچھی سی چائے پلاتی ہوں۔ چائے پی کر چلے تو مجھ سے تقاضا کیا "اچھا تو آپ کا مضمون کب آ رہا ہے عصمت کے لیے؟" میں خوش ہو کر بولی "میں ضرور کچھ نہ کچھ جلد ہی بھیجوں گی۔"

جلیل صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ آپ سے ناراض ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے ایک بار ان کا مضمون واپس کر دیا تھا اور مجھے لکھا تھا کہ "آخر بیگم صاحبہ کہنا کیا چاہتی ہیں"؟ اس دن سے انھوں نے عہد کر لیا ہے کہ کہیں بھی مضمون بھیجیں گی مگر عصمت کے لیے ہرگز نہیں لکھیں گی۔

میں شرم سے پانی پانی ہو گئی اور بھائی صاحب مجھے تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "آپ تو بڑی حوصلہ والی خاتون ہیں۔ آپ لکھتی جائیے۔ لکھنا اسی طرح آئے گا۔ بھائیوں سے ناراضگی کیسی۔ اسی میں آپ کا فائدہ ہے۔ اچھا تو اب ہم چلے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے تاکید کرتے گئے "میں آپ کے مضمون کا انتظار کروں گا"۔

کہاں تک یاد کروں ان کی اچھی اچھی دلآویز باتیں۔ ان کی ایسی ہی مختصر باتوں کا ایک افسانہ تیار ہو سکتا ہے۔ کسے معلوم تھا اتنی جلد وہ

دن بھی آجائے گا جب کہ وہ ہنسانے والا، تسلی دینے والا بھائی پھر کبھی ہنسانے یا تسلی دینے کے لئے اس دنیا میں نہ رہے گا۔

اب قدوائی صاحب کے نام بھابھی نازلی کا خط آیا ہے جس میں بھائی رازق کی طرح لکھا ہے کہ ہرمزی بہن سے بھی کہئے کہ "عصمت" کے لیے مضمون بھیجیں۔ تعزیت کے لیئے ہم دونوں ان کے پاس گئے تھے تو بھابھی نازلی نے مِلیل صاحب سے دوران گفتگو کئی بار کہا کہ مرحوم آپ کی بیگم کے یعنی میرے بہت مداح تھے۔ اکثر کہتے تھے کہ ہرمزی بیگم بہت سلیقہ مند اور باحوصلہ خاتون ہیں۔ بھابھی صاحبہ کی باتیں سن کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور صرف اتنا کہہ سکی کہ وہ خود اتنے اچھے، محبت کرنے والے تھے اسی لیے مجھ جیسی پھوہڑ میں بھی خوبیاں دیکھتے تھے۔

افسوس کہاں ملیں گے ایسے چاہنے والے بھائی۔

ہم دونوں بھابھی نازلی سے پرنم آنکھوں کے ساتھ رخصت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے بچوں کو، بھابھی صاحبہ کو اور ان کے تمام اہل خاندان کو، جس میں خود کو اور اردو کی بیسیوں اہلِ قلم بہنوں کو بھی شامل کرتی ہوں، صبر عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

علی گڑھ میں ۲۶-۱۹۲۵ء میں وہ اور میں بی اے میں ہم جماعت تھے مگر وہاں ملاقات نہ ہوئی۔ فرماتے تھے وہاں آپ کے پاس سے گزرتے ہوئے فرشتوں کے پر جلتے تھے۔ شاید یہ اشارہ اس امر کی طرف تھا کہ مجھے وہاں کے بعض نامور اساتذہ مثل رشید صدیقی، مولانا عبدالعزیز میمن[1] اور اونچے قسم کے طالب علموں مثلاً خواجہ منظور حسین اور مختار حامد علی کا قرب حاصل تھا جن سے عام طلباء کا ملنا جلنا ان کے قیاس میں بھی نہ آسکتا تھا۔

جب کئی سال بعد بڈھا طوطا بن کر میں اُردو میں ایم اے کرنے الٰہ آباد یونیورسٹی گیا تو وہ وہاں اُردو کے استاد ہو چکے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ سے الٰہ آباد واپس آکر اُردو میں ایم اے کر لیا تھا۔ میں اس اثنا میں علی گڑھ میں دفتر رجسٹرار میں جھک مارتا رہا تھا۔ اور علی گڑھ سے اپنی آمدنی سے ال ال بی پاس کر کے اپنے سابق وطن اناؤ (یوپی۔ اودھ۔ انڈیا) میں وکالت کے پریکٹس کرنے میں ناکام رہا تھا۔

مجھے اُردو میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کرنے اس لیے جانا پڑا کہ اُس زمانے میں اُردو میں ڈگریاں بہت کم ملتی تھیں۔ خود علی گڑھ میں اگرچہ اُردو لازمی مضمون تھا اختیاری مضمون نہ تھا اور اس جگہ فارسی زبان کے ایم اے اُردو زبان پڑھانے کے لیے مقرر ہوتے تھے۔ علی گڑھ میں اس کی اختیاری مضمون کی اہمیت جس کے بعد ایم اے اور آنرز کی ڈگریاں ملنے لگیں۔ نیز تحقیق کا دروازہ بھی کھل گیا، سید راس مسعود صاحب کی دلچسپی کا نتیجہ تھا جب وہ وائس چانسلر ہوئے یعنی فیصلہ اُن کے توجہ سے ہوا اگرچہ اُن کی اسکیم پر عمل اُن کے علی گڑھ سے چلے جانے کے بعد ہوا۔

اعجاز صاحب ہماری جماعت کو پڑھاتے وقت میری وجہ سے سخت

---

[1] میمنی، اگرچہ صحیح ہو، موصوف کے پاکستان تشریف لے آنے کے بعد کراچی میں اُن کے نام کے ساتھ تحقیق ہوا۔

سراسیمہ رہتے تھے اور کئی بار مجھ سے کہا کہ آپ میرے لیکچر میں نہ آیا کریں۔ آپ سے ڈر لگتا ہے۔ یہ ان کا حسنِ ظن بلکہ کریم النفسی تھی۔ کریم النفس تو وہ اور طرح بھی تھے اور کسی ضرورت مند کی حتی الامکان بڑی سے بڑی مالی امداد تک سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اپنی اس فطرت کے باعث وہ زندگی میں کئی بار سخت مشکلات میں مبتلا ہوئے۔ شاید ہی ان کا کوئی طالبِ علم ان کی سیرت کے اس پہلو سے ناواقف ہو۔

انھوں نے علی گڑھ میں میرے لیکچرار ہونے کی خوشی میں الٰہ آباد میں جہاں میں ڈگری لینے گیا تھا اپنی نو تعمیر کوٹھی "نشیمن" میں ایک شاندار دعوت کی تھی جس میں استاذی پروفیسر ضامن علی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور پروفیسر نعیم الرحمٰن (اب مرحومین) شریک تھے۔ ہمارے درمیان بے حد قریبی تعلقات ہو گئے تھے اور اعجاز صاحب جب بھی پاکستان تشریف لاتے تھے ناممکن تھا کہ غریب خانے پر یا میرے دفتر میں ملاقات کے لیے کئی بار تشریف نہ لائیں۔

ایک بار ان کی آمد کی تقریب پر میں نے ایک نشست میں انیس کے مراثی کے اپنے انتخابات انھیں پڑھ کر سنائے تو بہت خوش ہوئے۔ نئی بات یہ تھی کہ میں نے الگ الگ عنوانات قایم کر کے کلام منتخب کیا تھا۔ یہ متفرق نظموں کی شکل میں میری بیاضوں میں آج تک نقل کیے ہوئے پڑے ہیں بلکہ ان کی روشنائی اڑنے لگی ہے۔ میں نے علی گڑھ میں میٹرک کے اپنے مرتب کیے ہوئے نصاب "حسنِ انتخاب" میں انھیں شامل کیا تھا۔

موصوف نے اپنی "مختصر تاریخ ادبِ اردو" اور "ملک ادب کے شہزادے" نیز دوسری کتابوں میں میرا اور میرے کام کا ذکر بڑی تفصیل اور محبت سے کیا ہے۔ اپنے سبھی شاگردوں سے انھیں انتہائی محبت تھی۔ وہ محبت کے پتلے تھے اور اپنے شاگردوں سے تو شاید ہی کسی استاد نے اتنی محبت کی ہو۔ ان کی محبت میں بھولپن اور سادگی کا خوبصورت امتزاج تھا۔

ڈاکٹر احسن فاروقی

ڈاکٹر احسن فاروقی کی اچانک موت سے میرا ہی نہیں ملک کے تمام اہلِ قلم کا دل ٹوٹ گیا، علمی مجلسیں سونی ہوگئیں، عروسِ ادب کا سہاگ لٹ گیا۔ وہ پاکستان میں انگریزی کے مانے ہوئے استاد اور اردو ادب کے مستند ادیب، افسانہ نگار، ناول نویس اور نقاد تھے۔ ان کی علمیت کی تھاہ معلوم کرنا مشکل تھا اور استاد ہونے کے باوجود وہ اپنے علم و فضل کو اتنی آسانی، اتنی سادگی کے ساتھ اور مرحوم ڈاکٹر ممتاز حسن کی طرح اتنے گھریلو، اتنی بات چیت کرنے والے انداز یعنی اتنے غیر اُستادانہ اور غیر رسمی طریق پر اپنے سامعین یا شاگردوں اور دوستوں تک پہنچاتے تھے کہ ان پر عالم ہونے کا گمان نہ ہوتا تھا۔ بے شک ڈاکٹر ممتاز حسن کا دائرۂ موضوعات وسیع تر تھا مگر موضوع متعلقہ پر طریق اظہار اور تنقید کا انداز دونوں کا کم و بیش یکساں تھا۔ شاید اس طریقِ اظہار کے سلسلے میں پروفیسر کرار حسین کا نام نامی بھی لیا جاسکتا ہے۔

ناول نویسی، افسانہ نگاری میں تو قصے کو دل میں اُتارنے اور ایک عہد یا نقطۂ نظر یا ماحول یا تہذیب کی کامیاب عکاسی کی غرض سے اُنھیں سادہ پُرکار اور فصیح ہونا ہی تھا، احسن فاروقی کی تنقید بھی معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت شگفتہ اور رواں ہوتی تھی[1]۔ اس میں کوئی نہ کوئی اپج ضرور ہوتی اور وہ قاری کو نہ صرف فن یا فن کار کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں مدد دیتی بلکہ ہمارے بعض تنقید نگاروں کے برخلاف جو تنقید کو خانوں میں بانٹ کر زیادہ تر اپنے اپنے مکتبۂ فکر کا پرچار کرتے ہیں، احسن فاروقی کی تنقید بجائے خود ایک تخلیقی ادب پارہ

---

[1] آج کل "رواں دواں" لکھنے کا دستور ہے مگر میری اَمّی رواں دواں صرف پریشان حالی یا رَد بَد حالت کے اظہار کے سلسلے میں بولتی تھیں۔ بلکہ کبھی رواں دواں اور رَد بَد ایک ساتھ بولتی تھیں۔

ہوتی۔ ضروری ہوتا تو اس میں بڑے ناموں کے حوالے بھی آتے ورنہ وہ خود بڑے تھے اور تنقید صاف صاف اُن کے ذاتی تاثر کا نتیجہ ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ موضوع میں اُتر کر لکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی اور آل احمد سرور کی تنقید کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔

اس وقت جلدی میں احسن فاروقی کی تنقید کا یہ نمونہ سامنے آگیا۔ اُنھوں نے سراج الدین ظفر مرحوم کی شاعری پر یوں اظہار خیال کیا تھا:-

"وہ اپنے فن کے بڑے مخلص تھے۔ دل کی آواز سُن کر دل ہی سے پوچھتے تھے کہ یہ ٹھیک ادا ہوئی یا نہیں۔ صحتِ زبان، ندرتِ بیان، جدتِ خیال داد اسب ان کے دل سے نکلے ہوئے جذبے کے سامنے غلام کی طرح آکر گر پڑتے تھے۔ غزل زندہ ہے اور زندہ رہے گی مگر اس وقت آنکھیں چاروں طرف دوڑا رہا ہوں۔ ان کے مقابلے کا غزل گو کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ اور جب اس صدی کی غزل گوئی پر نظر دوڑاتا ہوں، تو تقسیم کے بعد اُبھرنے والے غزل گویوں میں ان کا ہم سر نہیں ملتا[1]۔ وہ بڑے شاعر تھے کیوں کہ اُن کے یہاں فکر اور طرزِ ادا دونوں نے بڑا درجہ حاصل کیا ہے اور اُن کا یہ مشغلۂ حیات بڑی ہستی کی آئینہ داری کرتا ہے ؎

دل کو بحر و بر کا سینہ چیر کر رکھ دیجیے
رات کو بھر پاتے گل ر دیاں پہ سر رکھ دیجیے!"

بیان کی یہ سادگی اور روانی احسن فاروقی کے دوسرے سنجیدہ مضامین کے بھی امتیازی خصوصیات تھے۔ ناول نویسی اور تنقید کے علاوہ پاکستان میں قومی زبان کے مسئلہ پر ایک بار اُنھوں نے میری فرمائش پر راس مسعود سوسائٹی کے ایک مذاکرہ میں اظہار خیال کیا تھا۔ دیکھیے اُردو اور بنگلہ کے تنازعے پر کتنی واشگاف اور دو ٹوک باتیں کتنے سیدھے سادھے اور ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہے ہیں:-

"۱۹۵۶ء کے دستور نے پاکستان کی دو قومی زبانیں بنا دیں اُردو اور بنگالی۔ بنگالیوں نے اُردو کو اپنے حساب بنگلہ دیش سے نکال

---

[1] کیا میں کہوں کہ تاثراتی تنقید میں آج مجھے کوئی فاروقی کا ہم سر نہیں ملتا؟

دیا اور اُن کی تجویز یہ نظر آتی ہے کہ اُردو بولنے والوں کو یا تو بنگال سے بالکل نکال دیں یا قتل کر ڈالیں یا پھر انھیں اُردو چھوڑ کر بنگالی اپنانے پر پوری طرح سے مجبور کریں۔ وہ اکثریت ہیں اور جمہوریت میں اکثریت ہی راجہ ہوتی ہے اس لیے وہ راجہ ہے اور راجہ جو چاہے کرے۔ مگر غضب یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی چھوت، سندھی بولنے والوں کو بھی لگا دی ۔۔۔ اب وہ بڑے پُر لطف استدلال پیش کر کے اور پاکستانی قومیت کے نظریے کو اسی طرح پس پشت ڈال کر جیسے بنگالیوں نے ڈالا سندھی کو بھی قومی زبان منوانا چاہتے ہیں۔ خیر یہ سندھ کے تمام لیڈر بھی دیکھ رہے ہیں کہ سندھی زیادہ سے زیادہ صوبائی زبان ہو سکتی ہے اس لیے قومی زبان کے مسئلے میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔"

یہ وہ انداز بیان ہے جو بولنے اور لکھنے میں کوئی فرق نہیں رکھتا۔ شاعری کی زبان میں اسے سہل ممتنع کہتے ہیں۔ یہ احسن فاروقی کا آرٹ تھا جس پر کسی اور کو دسترس نہیں ضمناً اس معجزۂ فن کو بھی دیکھیے کہ بنگلہ دیش میں اُردو اور اس کے خدمت گزاروں کی حالت زار کی بابت کتنی سچی پیش گوئی کر گئے اور اس حقیقت پر بھی روشنی ڈال گئے کہ قوموں کی اکھاڑ پچھاڑ میں زبانوں کے تنازعے کو کتنا دخل ہوتا ہے۔

ظفر کی شاعری والے مضمون میں موصوف کے سبب مرگ یعنی اُن کا جس "بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا" اس کی بابت احسن فاروقی نے لکھا تھا :-

"معلوم ہوا ہسپتال میں ہیں۔ دل کا دورہ پڑا ہے۔ دل کا دورہ آج کل کچھ ایسا عام ہو گیا ہے اور ڈاکٹروں نے اس پر اس قدر قابو پا لیا ہے کہ مجھے کچھ زیادہ تشویش نہیں ہوئی مگر دو ہی دن بعد صبح ہی اخبار میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی۔"

اس پر مجھے اس سے زیادہ تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ ظفر مرحوم کو تو دل کے دورے نے دو دن کی مہلت دی۔ احسن کو دل کے دورے نے فوراً دبوچ لیا۔ شاید اس جرم میں کہ انھوں نے اس مرض پر ڈاکٹروں کے قابو پا لینے پر کیسا طفلانہ اعتماد کیا تھا۔ چنانچہ بقول اکبر الہ آبادی ؂

ع آسماں بولا کہ ہم سے اُڑ کے جائیں گے کہاں[۵۱]

احسن فاروقی پہلے کراچی اور پھر حیدر آباد، سکھر اور کوئٹہ میں رہے مگر سچ پوچھیے تو اُن کا دل کراچی میں پڑا رہتا تھا اور وہی ان کا مستقر اور ان کے اہل و عیال کا مرکز تھا مگر وہ اُن لوگوں میں سے تھے کہ کہیں ہوں جب کبھی کراچی کے رہنے والوں کا ان سے ملنے کو جی چاہتا وہ یہیں موجود پائے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے گھر پر کم اور شاید رات ہی کا کچھ حصہ ٹھہرتے تھے اس لیے کہ دن میں اور شام کو وہ زیادہ تر اپنے دوستوں کے پاس یا ادبی اداروں اور علمی مجلسوں میں نظر آتے تھے۔ انھیں لباس کا کوئی خاص شوق نہ تھا نہ سواری کی کچھ ایسی ضرورت معلوم ہوتی تھی۔ سادے سے کوٹ پتلون یا صرف بوشرٹ اور پتلون میں بغل میں کتابیں اور رسالے دبائے جلدی جلدی پیدل چل کر دور دور کے دھاوے مارتے تھے۔ میری سرکاری اور بعد میں انجمن ترقی اُردو کی ملازمت کے دوران وہ میرے پاس تشریف لاتے اور دیر دیر تک بڑی دلچسپ باتیں کرتے رہتے تھے۔

اُن میں بڑا لطیف ذوقِ ظرافت تھا اور وہ اُس سے جی بھر کر کام لیتے تھے خواہ اس کی ضرب کاری خود ان کے دوستوں ہی پر بلکہ جس دوست سے باتیں کر رہے ہوں اسی پر کیوں نہ پڑے۔ میں انجمن کے لغات کے پروجیکٹ کا انچارج تھا اور ڈکشنریوں کے مختلف ایڈیشنوں کی نظرِ ثانی یا تیاری اور طباعت کے کام میں میں نے کم و بیش سولہ سال صرف کیے مجھے اس کام میں اُلجھا دیکھتے تو کہتے: "شنیدہ کے بود مانند دیدہ، بابائے اُردو کے بارے میں تو صرف سُنا ہے" آپ کو ڈکشنریوں پر کام کرتے دیکھا، ہم تو آپ ہی کو لغت نویس مانتے ہیں۔" ساتھ ہی یہ لطیفہ سنا دیتے "کسی عدالت میں ایک صاحب کی سیادت زیرِ بحث تھی۔ مجسٹریٹ نے ان کے گواہ سے ثبوت طلب کیا۔ بولے صاحب ہم نے دوسروں کے بارے میں تو سنا ہے

---

[۵۱] اکبر کا پورا شعر یوں ہے ؎

ارشیپ سے ہم اماں اے چرخ پائیں گے کہاں
آسماں بولا کہ ہم سے اُڑ کے جائیں گے کہاں!

کہ وہ سیّد ہیں مگر یہ تو ہمارے دیکھتے دیکھتے سیّد ہوتے ہیں!"

مشفق خواجہ جو انجمن میں میرے رفیق کار تھے اور مجھ سے پہلے بلکہ بابائے اردو کے زمانے سے موجود تھے احسن فاروقی انھیں داماد اردو کہتے تھے۔ اردو کے باپ (بابائے اردو) کے چہیتے ہونے کی بنا پر۔

لکھنے کے معاملے میں احسن فاروقی ہر وقت تیار رہتے تھے، اس حد تک کہ شاید زیادہ سنجیدہ تحریروں کے علاوہ ان سے کسی بھی موضوع پر قلم برداشتہ مضمون لکھوایا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ان کی ظرافت اور خوش طبعی کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھیے۔ ایک بار انھوں نے ایک ایسی شخصیت پر مضمون لکھ دیا جو ان کی بالکل جانی بوجھی نہ تھی۔ ایک صاحب کو اپنے مرحوم خسر کی یادگار کے طور پر جو دہلی کے ایک کالج میں ایک قابل اور مقبول استاد رہ چکے تھے، ایک مجموعۂ مضامین شائع کرنے کی سوجھی۔ بقول اکبر ؎

حضرت والد کی عزت یوں تو کرتا ہوں ضرور
دل کی لذت بڑھتی ہے لیکن خسر کو دیکھ کر!

انجمن سے متعلق ایک اہل قلم نے جو پروفیسر موصوف کے شاگرد رہ چکے تھے بطور سعادت مندی اُن سے مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا تھا مگر بعد میں اسے پورا نہ کر سکے۔ ایک دن احسن فاروقی میرے پاس بیٹھے تھے کہ مؤلف صاحب کا میرے پاس فون پر اُس مضمون کا تقاضا آیا۔ احسن نے فوراً کہا "میں مضمون لکھ دوں؟" میں نے اُن سے پوچھا "آپ اُن پروفیسر صاحب سے واقف تھے؟" بولے واقفیت کے بعد لکھا تو کیا بات ہوئی؟" اور اسی وقت مجھ سے کاغذ لیا اور بیٹھے بیٹھے کوئی پون گھنٹے میں تین چار صفحات گھسیٹ دیئے۔ ایک جیتی جاگتی قلمی تصویر۔ پروفیسر صاحب کلاس میں یوں داخل ہوتے تھے، یوں پڑھاتے تھے۔ یوں اپنے شاگردوں پر شفقت فرماتے تھے، علم کا بحر ذخار تھے۔ اُن کا پڑھایا ہوا فوراً دل پر نقش ہو جاتا تھا وغیرہ وغیرہ، ایک ٹوپی جو کسی بھی قابل اور ذمہ دار پروفیسر کے سر پر ٹھیک بیٹھ جائے۔ مگر چونکہ تفریحی چیز تھی اشاعت کے لیے نہیں دی گئی۔

کچھ توہم پرست بھی تھے۔ سندھ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں وہاں کے وائس چانسلر سے کسی اختلاف کی بنا پر فاروقی صاحب کو

کو کچھ عرصے کے لیے شغل بیکاری سے واسطہ پڑا تھا مگر معاملات روبراہ ہونے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ نواب شاہ کے ایک ادبی اجتماع میں میرا ان کا ساتھ تھا۔ مصطفےٰ زیدی مرحوم وہاں ڈپٹی کمشنر تھے اور اُن کے اصرار نے کراچی کے بہت سے اہلِ ذوق کو جمع کر لیا تھا۔ کئی دن کی ادبی مجلسوں، مشاعروں اور دیگر مصروفیات نیز عصرانوں اور دعوتوں کے بعد ایک صاحب نے ہم لوگوں کو اپنے دولت خانہ پر دوپہر کی دعوت طعام پیش کی۔ اسی سہ پہر کی گاڑی سے ہمیں کراچی واپس آنا تھا۔ ریلوے اسٹیشن ان کے گھر کے سامنے ہی تھا۔ طے ہوا کہ سامانِ سفر براہِ راست پہلے اسٹیشن بھیج دیا جائے اور ہم کھانے سے فراغت پا کر میزبان کے گھر سے پیدل چل کر ریل پر سوار ہو جائیں۔ جب ہم سب وہاں سے اسٹیشن روانہ ہوتے تو راستے میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ نہ پایا۔ بڑا فکر و تعجب ہوا مگر پیچھے مڑے تو دیکھا زمین پر اکڑوں بیٹھے انگشتِ شہادت سے کچھ لکھ رہے ہیں پھر اپنے لکھے کو جوتے سے پیٹ بھی رہے ہیں۔ پکڑ کر لائے گئے تو فرمایا مجھے ٹھیک ۱۲ بجے دوپہر کو کسی پیر کا ہے پر اپنے دشمن کا نام سڑک پر لکھ کر اسے چار جوتے مارنے کی ہدایت ہے"۔ یہ سن کر ہم سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا مگر کچھ عرصے بعد کراچی میں اُن سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ نسخہ تیر بہ ہدف ثابت ہوا اور وہ اپنے کام پر بحال ہو گئے ہیں۔

نواب شاہ میں ہمارا قیام ایک ہی کمرے میں تھا۔ شاہد دہلوی مرحوم بھی ساتھ تھے مگر جس قدر وہ "چپ شاہ" تھے اسی قدر احسن فاروقی گفتگو کے بادشاہ تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے ایک پوری رات باتیں کرنے میں گزار دی۔ نہ خود سوئے نہ ہمیں سونے دیا۔ ایسے وقت میں اُن کے بیٹھے رہنے اور باتیں کرنے کا خاص انداز تھا۔ بستر پر اُکڑوں بیٹھ کر پتلون کی جیب سے بٹوہ اور چنوٹی نکالی، چھالیہ اور خشک کتھا چونا ایک ہتھیلی پر رکھ کر دوسری سے اسے ملتے رہے۔ پھر وہ سارا مرکب پھانک لیا۔ اب ہونٹ اور منہ چلا چلا کر اور دونوں ہاتھ سامنے لا کر ہتھیلیوں کو گھما گھما کر ایک دوسرے سے ملتے ہوئے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اپنے لعابِ دہن اور منہ میں "گٹکے" سے پیدا ہونے والے رس کی مدد سے رسیلی باتیں، دنیا بھر کی، کام کی بھی اور بیکار بھی،

بڑی لچھے دار باتیں کیٹس اور بائرن کی، انیس اور غالب کی، جوش اور فراق کی، لکھنؤ اور دہلی کی، کراچی اور سکھر کی، یہاں تک کہ

ع سحر کا وقت ہے اللہ کا نام لے ساقی (اقبال)

کا مرحلہ آگیا اور اذان ہونے لگی

ع وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار (اقبال)

مگر اب احسن فاروقی صاحب

ع آ میرے سوئیں سر سے دوپٹے کو تان کر

کی "نقل مطابقِ اصل" بن کر ایک چادر اوڑھ اپنے بستر پہ لمبے لمبے لیٹ گئے۔

نظر حیدرآبادی

ع اِیں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد!

وہ عمر کے اعتبار سے جوان مگر اپنے فن میں پختہ کار تھا۔ حیدرآباد دکن کے جن شعرا نے نئی اُردو شاعری پر اپنا نقش ثبت کیا ہے وہ ان میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور وہاں کے جدید نام آوروں میں سرفہرست تھا۔ وہ محض البیلا اور متوالا ہی نہ تھا حقیقت کا متلاشی اور زندگی کا ادا شناس تھا۔ وہ شعلوں سے کھیلتا اور تھپیڑوں سے ٹکر لیتا تھا۔ وہ اپنے دور کے ہر انقلاب سے متاثر ہوا۔ اس نے اگر ایک طرف سقوط حیدرآباد کے بعد اجنتا کی سرزمین کی یاد میں اپنے فن کی صلاحیتیں اور دل کی دھڑکنیں صرف کیں تو دوسری طرف اپنے نئے وطن میں معاشرتی و اخلاقی زوال پر اپنی آنکھوں سے خون بہایا۔ میری مراد اس کی دو نظموں سے ہے جن میں سے ایک کا پہلا مصرعہ

کیسے ہیں باد صبا اہل چمن میرے بعد

ہے، اور دوسری کا

ع بہ نام جشن آزادی یہ ساماں ہم نے دیکھا ہے!

حق یہ ہے کہ یہ دونوں نظمیں اس کے فن ہی کی بہترین نمائندگی نہیں کرتیں، اپنے دور کی منتخب نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں اور اس عہد کی تاریخ کے مرتب کے لیے بنیادی مسالے کا کام دیں گی۔

مگر وہ میرے ایک محبوب و محترم بزرگ کا بیٹا بھی تھا۔ اگر میں کہہ سکوں تو اس کی موت میرا ذاتی سانحہ ہے۔ حضرت علی اختر مرحوم خاموش محبت کرنے والوں میں تھے اور باپ کی اداؤں کو بیٹے نے اُڑا لیا تھا۔ جس سعادت مندی کے ساتھ اپنے باکمال باپ کے ہمراہ وہ مجھ سے پہلے دن ملا تھا آخر وقت تک اسی وضع پر قائم رہا۔

وہ ہمارے روایتی شعراء کی طرح از کار رفتہ نہ تھا۔ وہ تخیل کے خول میں نہیں رہتا تھا۔ جہد حیات میں حصہ لیتا اور کسب معاش کے لیے تگ و دو

کرتا تھا۔ وہ اپنی حد کے اندر نہ صرف اپنے اہل و عیال کا کفیل تھا بلکہ کنبہ پرور بھی تھا۔ اس زمانے میں بڑوں کو چھوٹوں کے سامنے اپنا بھرم رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اس کی شخصیت اور کردار کا کمال تھا کہ اس نے خردوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھا۔ اور ہر ایک کا دوست رہا۔ ایسے سعادت مند، کنبہ پرور، شریف اور محبت کرنے والے جوان کو یاد کر کے اگر اس کے بزرگ، گھر والے، بھائی بند اور دوست احباب پچھاڑیں کھاتے ہیں تو کیا بے جا ہے؟

کم و بیش تیس سال ہوئے ایک ایسے ہی سانحہ سے میرا کلیجہ پاش پاش ہو رہا تھا۔ اس وقت خداوند تعالےٰ نے میرے دل میں کچھ خیالات القا کئے جنہیں میں نے شعر کے قالب میں ڈھالا اور اس سے میرے مضطرب قلب کو قرار آیا۔ اس موقع پر، بہ خفیف تغیر، ان اشعار کو پیش کرتا ہوں۔ شاید متعلقین کی تسلی کا باعث ہوں ؎

کس قدر مجبور ہیں اتنا بھی کر سکتے نہیں
مرنے والا مر گیا ہم ساتھ مر سکتے نہیں

جان دینا کچھ نہیں دشوار لیکن کیا کریں
وقت سے پہلے جہاں سے ہم گزر سکتے نہیں

رہ رو راہ رضائے دوست ہونا چاہیئے
اک قدم بھی جب خلاف حکم دھر سکتے نہیں!

دعا ہے کہ خداوند تعالےٰ آں عزیز کی روح کو اپنی رحمتوں کے آغوش میں لے لے اور پس ماندگان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صبر عطا فرمائے۔ آمین[1]

---

[1] یہ مختصر تعزیتی تقریر کراچی کے ایک جلسہ میں ۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء کی رات میں کی گئی تھی۔

ضمیر صدیقی

علی گڑھ میں غالباً ۱۹۳۴ء میں ضمیر مرحوم انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں میرے شاگرد تھے۔ اس زمانے کے ان کے کئی ساتھی بھی جنھوں نے ضمیر کی طرح نام پیدا کیا مجھ سے پڑھتے تھے۔ شاید ہی کسی استاد کو ایک ہی وقت میں ایسے ہونہار شاگرد میسّر آئے ہوں۔ اس گروپ کے چند نام یہ ہیں۔ شان الحق حقّی، جی اے مدنی، علی سردار جعفری، سعادت حسن منٹو، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، معین الدین دردائی، ابو اللیث صدیقی[1] سبھی مجھ پر مہربان تھے[2] اور جو خدا کے فضل سے زندہ ہیں اب بھی مہربان ہیں۔ شان کا یہ حال ہے کہ خط بھیجتے ہوتے یا اپنی کوئی تصنیف یا تالیف ارسال کرتے وقت "استاذی" کے لفظ سے مجھے مخاطب کرنا نہیں بھولتے۔ ایک بار میرے گھر پر کچھ گڑبڑ کر کے مجھ سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ عرصہ کے بعد یوم بابائے اردو کے موقع پر ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا "کیوں جی؟ یہ کیا حرکت تھی؟" معاً سب کے سامنے سر جھکا دیا اور بولے "آپ میری گوشمالی کریں"۔ کچھ دن ہوئے علی سردار جعفری بمبئی سے کراچی آئے تھے۔ سعید جعفری صاحب کے ہاں مشاعرہ کی نشست ہوئی۔ میرے زمانے میں یہ بھی علی گڑھ میں ایم ایس سی کر رہے تھے۔

جلسہ کی ابتدا میں موصوف نے اعلان کیا "اس مجمع میں قدوائی صاحب سے زیادہ سینئر اولڈ بوائے کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا جلسہ کی صدارت وہی کریں

ضمیر مرحوم کی وفات پر کراچی پریس کلب میں کی گئی ایک تقریر۔

[1] قاعدہ سے ان کا نام پہلے آنا چاہیے تھا مگر جہاں تک یاد آتا ہے یہ مولانا احسن مارہروی کے سکشن میں تھے اور کچھ دن مولانا کے رخصت کے زمانے میں میں نے ان کے سیکشن کو بھی پڑھایا تھا۔ دردائی مرحوم اور ابو اللیث میں اچھی دوستی تھی۔

[2] مہربان میں نے سعادت مند کے معنوں میں لکھا ہے۔ علی گڑھ میں کسی استاد کو اپنے شاگردوں کی سعادت مندی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی تھی۔

گے"۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر چلا ہی تھا کہ علی سردار دور سے مجمع کو چیرتے پھاڑتے میری طرف لپکے یہ کہتے ہوئے کہ "قدوائی صاحب نے تو مجھے پڑھایا ہے" اور آکر مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ میں نے انھیں اپنا نالائق شاگرد بتایا کہ کراچی آتے ہیں اور مجھ سے ملے بغیر چلے جاتے ہیں۔ اپنی عمر کو دیکھتے ہوئے میں تو ان کی جائے قیام پر جا کر ان سے ملنے سے رہا۔ حالانکہ ڈاکٹر سلام نوبل انعام پانے کے بعد وطن آتے ہیں تو چھوٹی جماعتوں کے اپنے ریاضی کے ہندو استاد کے درشن اور پالاگن کی غرض سے کلکتہ کا طولانی بلکہ طوفانی سفر اختیار کرتے ہیں۔ سردار جعفری شرمندہ ہوئے، اپنا پتہ بتایا، میرا پتہ لیا اور دوسرے دن ابرار حسن خاں صاحب[۱] کے گھر پر نشست میں ان کا ساتھ رہا اور پھر کئی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ابواللیث میرا اتنا خیال کرتے ہیں کہ اسلام آباد میں اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے جلسوں کے دوران کئی بار میرے ساتھ رہے اور بیٹھے۔ ایک بار میرے ہوائی سفر کے سلسلے میں مجھے گھسیٹتے ہوئے جہاز تک پہنچایا ورنہ میں وقت پر کراچی واپس نہ آسکتا۔

میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ دل سے مجبور ہوں۔ تاممکن ہے کہ علی گڑھ کا نام آتے اور

ع ہم تھے کہ اڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے (اصغر)

کا مصداق نہ ہو جاؤں۔ میں کہہ رہا تھا کہ ضمیر مرحوم کی مجھ سے سعادت مندی پرانی تھی اور اس کا اظہار وہ ایک نئے طریقہ سے کرتے تھے۔ تقسیم سے قبل علی گڑھ سے ترک تعلق کر کے میں ہندوستان اور بعد میں پاکستان میں مرکزی حکومت کے اطلاعات اور دیگر متعلقہ شعبوں سے وابستہ ہو گیا تھا، اس سلسلے کو منقطع ہوتے بھی کوئی پچیس ۲۵ چھبیس ۲۶ سال ہو گئے گویا سرکاری ملازمت کی برابر کی ایک اور مستقل میعاد گزر چکی۔ میری ملازمت کے زمانے کے کچھ احباب شاید اس مجمع میں ہوں یا وہ لوگ جن سے ضمیر کہتے تھے "میں قدوائی صاحب سے بہت ڈرتا ہوں"، اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ لکھنا میں نے ان کی وجہ

---

[۱] سابق ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی اور ان کے بڑے بھائی میجر اسرار مرحوم بھی علی گڑھ میں میرے شاگرد تھے۔

سے سیکھا۔" اب وہ تو اس اجمال کی تفصیل بتانے کو زندہ نہیں رہے، میں ہی اس معمہ کو حل کرتا ہوں۔

ایک بار میرے لکچر کے دوران جماعت کے دو لڑکوں نے کوئی غیر معمولی شرارت کی۔ ایک یامین زبیری تھے (مشہور محقق و اہل قلم، میرے محترم مولوی محمد امین زبیری مرحوم کے صاحبزادے نیز نعمان زبیری کے بھائی جنھوں نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سلسلے میں نام پیدا کیا تھا) اور دوسرے ضمیر۔ میں نے دونوں کو جماعت سے باہر چلے جانے کو کہا۔ یامین نے تو معافی مانگ لی اگرچہ بہت شریر تھے (شاید یہ ڈر بھی ہو کہ ان کے والد صاحب سے شکایت کر دوں گا) مگر ضمیر نے معافی نہیں مانگی اگرچہ شریف اور نیک تھے۔ کہتے رہے کہ غلطی زبیری کی تھی میری نہیں۔ ضمیر آفتاب ہال میں رہتے تھے جو اولڈ بوائز نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مشہور اولڈ بوائے اور نامور وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی یادگار کے بطور غریب مگر قابل طلبا کے رہنے کے لیے قائم کیا تھا۔ پروفیسر حبیب اس کے پرووسٹ تھے۔ میں نے معاملہ اُن تک پہنچا دیا۔ انھوں نے ضمیر کو ہوسٹل چھوڑ دینے کا حکم دیا ورنہ معافی نامہ داخل کرنے کو کہا۔

اب ضمیر میرے پاس آئے، شرمندہ اور واقعتاً معذرت خواہ۔ میں نے معافی کی یہ شرط رکھی کہ وہ پہلے مجھے چھ مضامین لکھ کر دکھائیں بلکہ میرے منتخب کیے ہوئے تین انگریزی اداریوں کے اردو اور تین اردو اداریوں کے انگریزی ترجمے مجھے پیش کریں۔ انھیں یہ بھی یاد دلایا کہ اگر وہ اسے سزا سمجھتے ہیں تو یہ سزا خود کو بھی دے رہا ہوں کیونکہ ان ترجموں کو یونیورسٹی کے اوقات کے بعد شام کو انھیں ساتھ بٹھا کر اپنے گھر پر دیکھوں گا، ہفتہ میں ایک بار۔ اور اس طرح میں بھی ان کی خاطر اپنے کو بے آرام کروں گا۔ میں آپ سے کیا بتاؤں کہ ضمیر مرحوم نے یہ کام کتنی پابندی، قابلیت اور لگن سے کیا کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ اور آج تک ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ انھیں بھی کچھ آگیا اور میری بات بھی رہ گئی۔ وہ کہا کرتے تھے اور یہ اُن کی شرافت تھی کہ انھوں نے مجھ سے بہت کچھ حاصل کیا اور اس واقعہ کے بعد سے طالب علمی ہی کے زمانے میں انھوں نے کبھی کبھی اخبارات

میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ضمناً "ضمیر" کے اس واقعہ سے ان کی اور میری مادر علمی اور مسلمانوں کی مشہور درسگاہ علی گڑھ کی ساکھ کے بارے میں بھی بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آج کل کے علی گڑھ کا تو ہندو گردی کے طفیل حلیہ ہی بگڑ چکا ہے مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کی بابت بڑی غلط فہمیاں پھیل چکی تھیں۔ ایم اے او کالج کے فارغ التحصیل طلبا اور مسلم زعما کو شکایت تھی کہ یونیورسٹی بن جانے کے بعد اس ادارے میں ڈسپلن کا سابقہ بلند معیار ختم ہو گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ضمیر مرحوم کے واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے کون مسلم یونیورسٹی کے ڈسپلن پر نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ ایم اے او کالج اور مسلم یونیورسٹی کو چھوڑیے، وہ زمانہ اور تھا ہم غلام تھے اور ہماری تعلیمی و تربیتی پالیسیوں پر بہت حد تک غیر ملکی اثرات کا غلبہ تھا۔ کیا آج ہماری آزادی کے سالہا سال کے بعد تعلیم کا انتظام صد فی صد اپنے ہاتھ میں آجانے پر بھی ہمارے ملک کے کسی تعلیمی ادارہ میں طلباء کے ڈسپلن اور کردار کا یہ معیار مل سکتا ہے؟ اب تو اس قسم کے واقعات پر تیغ و تفنگ کی نوبت آجاتی ہے اور کالج اور یونیورسٹیاں طول طویل عرصوں کے لیے بند کر دی جاتی ہیں اور پڑھائی جو غارت ہوتی ہے اس پر پوری قوم نالاں ہے۔

اگرچہ ضمیر مرحوم نے باقاعدہ اخبار نویسی کا سلسلہ غالباً ۱۹۳۸ء میں یا اس کے لگ بھگ دہلی کے انگریزی روزنامے "نیشنل کال" سے شروع کیا تھا مگر جیسا کہ میں نے اُن کے بارے میں اوپر کہا ہے بے قاعدہ اخبار نویسی وہ طالب علمی کے زمانے ہی میں کرنے لگے تھے یعنی کچھ پیسے کمانے کی غرض سے یونیورسٹی کی خبریں اسٹیٹسمین کلکتہ اور ہندو مدراس کو کبھی کبھی بھیجتے رہتے تھے۔ شاید ان کے شوق کو بڑھانے میں ان کے بعض ہم عصر طلباء کا بھی دخل تھا۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ تھا جب خواجہ احمد عباس (دبا چھوا) نے بمبئی کرانکل سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کی وجہ سے یونیورسٹی کو ایک بار کچھ مشکل بھی پیش آئی مگر یہ دوسرا قصہ ہے۔ ضمیر مرحوم کی تحریروں نے کبھی یونیورسٹی کے لیے مشکل نہیں پیدا کی۔

اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ہمہ تن اخبار نویسی کے ہو گئے اور اپنی

کامیابیوں سے مطلع کرنے کی غرض سے دہلی میں کبھی کبھی میرے پاس آتے رہتے تھے۔ پھر تو انھوں نے خوب پر پرزے نکالے اور علاوہ دوسرے اخباروں کے سلسلوں کے پاکستان میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ سے متعلق رہے۔ پھر انھوں نے شادی کی تو آہستہ آہستہ ہم دونوں کے گھرانوں میں دوستی ہوگئی اور آنا جانا قائم ہوگیا۔ اپنی بیگم صاحبہ کی وفات کے بعد وہ کچھ بجھ سے گئے تھے اور ان سے ملاقات بھی دیر دیر سے ہونے لگی تھی مگر انھوں نے اپنے پیشہ ورانہ معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا وہ پاکستان کے ایک سینیئر نامور جرنلسٹ ہو کر دنیا سے سدھارے۔

اُن کی زندگی ان کے ہم پیشہ نوجوانوں کے لیے قابل تقلید بلکہ قابلِ رشک ہونی چاہیئے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں

شیخ محمد اکرام

سلسلۂ کوثر جسے میں "کوثریات" کا نام دیتا ہوں یعنی چشمۂ کوثر، رودِ کوثر اور موجِ کوثر، نیز غالب نامہ، شبلی نامہ وغیرہ کے نامور مصنف شیخ محمد اکرام، ایم اے، ایم آر سی اے ایس، آئی سی ایس اور پاکستان کے قیام کے بعد سی ایس پی (یہ اُن کی کتابوں کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ ضرور چھپا ہوتا تھا) ہمارے (یعنی وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومتِ پاکستان کے) ڈپٹی سیکرٹری، پھر جائنٹ سیکرٹری رہے۔ میں نے ان کی متذکرہ کتابوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا ہے، خصوصاً سلسلۂ کوثر جسے انھوں نے "اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی اور روحانی تاریخ" یا "ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور روحانی تاریخ" یا "ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ" کہا ہے، بلا شبہ اُن کی ایسی قابلِ قدر، بیش بہا، معلومات افزا اور پُر خلوص کوشش ہے جو عام قاری کو اس موضوع پر لاتعداد ضخیم جلدوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیتی اور ان کے نام کو بقائے دوام بخشتی ہے۔

اُن کے ماتحتوں کو اُن کی بدمزاجی اور روکھے پن کی شکایات تھیں اور اس سلسلے میں میرے علم میں بھی چند واقعات بلکہ چشم دید حالات ہیں لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذاق اور خیال کے مخالف کوئی بات بالکل برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی صحبتِ ناجنس ان کے لیے انتہائی صبر آزما ہوتی تھی اور ایسی حالت میں ان کے عمل یا ردِ عمل کو غصے کے بجائے غم یا آزردگی اور بدزبانی کے بجائے جھلاہٹ سے موسوم کرنا چاہیئے جو شاید کم غیر شریفانہ حرکات سمجھی جائیں بلکہ ایسی حالت میں شخص متعلقہ کو قابلِ ہمدردی قرار دیا جانا چاہیئے۔ لیکن اہلِ کمال نیز اپنے ماتحت اہلِ علم اور دانشوروں کے ساتھ اُن کا برتاؤ عموماً شریفانہ اور قابلِ تعریف تھا۔ ایک اور خرابی کے لیے پاکستان کے افسر بدنام رہے ہیں یعنی صوبائی تعصب۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ عیب بھی ان میں نہیں تھا اور خود

ہمارے شعبے میں انھوں نے صرف قابلیت کو معیارِ ترقی قرار دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مثلاً میرے ہی ایک معاملے میں، کہ غیر مقامی ہوں، انھوں نے مجھے بڑھانا چاہا مگر فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے اس وقت کے چیرمین کے آگے جن سے اُن کی پرخاش تھی اور جن سے بابائے اردو بھی ہمیشہ بیزار رہے۔ ان کی ایک نہ چلی اور مجھے ان چیرمین صاحب کے چلے جانے کے بعد ترقی ملی[1]۔ خیران بزرگ کی ایک الگ داستان ہے جو شاید بہ شرطِ زندگی پھر کبھی بیان ہو۔

مگر مجھے شیخ صاحب سے مولانا سید سلیمان ندوی کے سلسلے میں ضرور شکایت رہی۔ اب دونوں خدا کے جوارِ رحمت میں ہیں۔ مگر شیخ صاحب نے خود ہی دو موقعے ایسے نکالے کہ بہ حیثیت ماتحت مجھے تعمیلِ ارشاد کے دعدہ کے سوا چارہ نہ رہا پھر بھی انھوں نے میری پوزیشن گرانے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ مولانا سے میری علی گڑھ کے زمانے سے نیاز مندی تھی۔ وہ امتحانات اور تعلیمی مشاورت کے سلسلے میں اعظم گڑھ سے وہاں وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہتے تھے اور رشید صاحب اور مولانا ابو بکر محمد شیث[2] نے اُن سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔ پھر میں "معارف" میں مضمون لکھنے یا کبھی کبھی اپنا کلام بھیجنے لگا۔ شعبۂ اُردو میں بہ حیثیت لکچرر میرے تقرر میں اُن کی رائے کو بڑا دخل تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ انتخابی کمیٹی کے ایک دوسرے فعال ممبر علامہ اقبال کی میرے حق میں رائے بھی زیادہ تر انھیں کی رائے سے متاثر تھی۔ جب مولانا سلیمان ندوی مستقل طور پر کراچی تشریف لے آئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ میں ان دنوں شعبۂ مطبوعات میں تھا اور میرا ایک کام رسالوں کی نگرانی بھی تھا۔ میں رسالہ "ماہِ نو" کے ایک خاص نمبر کے لیے مولانا کی غزل ان کے دستِ مبارک سے لکھوا کر لے آیا جس کا میں نے بلاک شائع کیا۔ موصوف نے پہلے تو پس و پیش کیا پھر

---

[1] اس وقت ہمارے سیکرٹری سید ہاشم رضا تھے جنھوں نے پبلک سروس کمیشن کو میرے حق میں جیت کیا۔

[2] ڈین شیعہ سنی مذہبیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

خوشی خوشی صوفے سے اُتر کر ہم دونوں قالین پر بیٹھ گئے اور وہیں انھوں نے اپنی غزل صفحۂ قرطاس پر اپنی خوشنما تحریر میں رقم کر دی۔

شیخ صاحب کو ان باتوں کا علم تھا۔ انھوں نے مجھ سے اعتراف کیا کہ اپنے "شبلی نامہ" کے بعض بیانات سے انھوں نے مولانا کے دل میں تکدر پیدا کر دیا ہے جسے وہ دور کرنا چاہتے ہیں اور کہا کہ مجھ سے ممکن ہو تو کسی وقت انھیں اپنے ساتھ مولانا کے پاس لے جا کر ان کی شکایت رفع کرانے میں مدد کر دوں۔ میں نے مولانا سے ذکر کیا تو وہ بہ خوشی شیخ صاحب کی اپنے دولت کدے پر پذیرائی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ مگر اب میں نے دیکھا کہ وہ لیت و لعل سے کام لینے لگے اور میرے بار بار یاد دلانے کے باوجود انھوں نے اس کام کے لیے وقت نکالنا تھا نہ نکالا اور مولانا کے پاس چلنے سے صاف انکار بھی نہ کیا۔ شاید مولانا سے ملاقات کی تجویز پیش کرتے وقت انھوں نے اپنی ہمت کا غلط اندازہ کیا تھا۔

پھر جب مولانا حسرت کا انتقال ہوا تو شیخ صاحب نے فرمایا کہ مرحوم پر "ماہِ نو" کے لیے مولانا سلیمان سے مضمون حاصل کر دوں۔ مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ ان کی کانگریس کی زندگی کا بھی مضمون میں ذکر آئے گا تو مجھے اس کے چھاپنے میں کوئی عذر تو نہ ہوگا۔ میں نے شیخ صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد عرض کر دیا کہ اس سلسلے میں اُن پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ مگر مضمون آیا تو شیخ صاحب پہلے اسے خود دیکھنے پر مُصر ہوئے اور اس کے بعض حصّوں کی وجہ سے انھوں نے مجھے اسے "ماہِ نو" میں شامل کرنے سے باز رکھا۔ مجھے مولانا کو مضمون واپس کرنے کی ہمت نہ ہوئی مگر انھوں نے میرے گھر پر اپنا آدمی بھیج کر اسے منگا لیا[1] اور میں سید صاحب کے وصال کے وقت تک انھیں اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ ہو سکا۔ اس کا مجھے آج تک ملال ہے اور جب خیال آتا ہے تو اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے!

دو ایک اور باتیں شیخ صاحب کی عجیب تھیں اور میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ وہ اُردو کے پرانے خدمت گزار تھے۔ بابائے اُردو نے

---

[1] یہ مضمون پورے کا پورا بعد میں غالباً 'معارف' میں شائع ہوا۔

انھیں انجمن کی منتظمہ پر لے رکھا تھا۔ ان کے پاس ایک تصویر تھی جس میں وہ علامہ اقبال کے ہم نشین تھے۔ یہ تصویر ان کے دفتر کی میز پر رکھی رہتی تھی۔ لیکن تعجب سا تعجب ہے کہ علم و ادب کا ایسا قابلِ قدر پس منظر رکھتے ہوئے بھی ایک بار جب خواجہ ناظم الدین کی ایک اولاد کی شادی کے لیے اُردو میں دعوت نامے کے مضمون تیار کرنے کا موقع آیا تو شیخ صاحب نے اپنے دفتر میں مجھے اور شعبے کے دیگر کئی اہلِ قلم کو بلا کر بٹھا لیا اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر گھنٹوں کی رد و قدح کے بعد کہیں وہ مسودہ تیار ہوا۔

ایک بار شیخ صاحب نے منصوبہ بنایا کہ اپنے ملک میں نئی قومیت کا جذبہ اُبھارنے اور اسے ترقی دینے کے لیے تقسیم کے بعد سے پاکستان یا پاکستان سے متعلق دیگر موضوعات پر جتنی نظمیں شایع ہوئی ہوں اُن کا ایک اعلیٰ درجے کا انتخاب تیار کیا جائے۔ کسی سرپھرے نے کہیں لکھ دیا تھا کہ پاکستان جذبۂ ملی کا رہینِ منت تھا مگر اس کے قیام پر اُردو شعرا نے وہ جوش و خروش نہیں دکھایا جو ایران کی سیاسی کشمکش کے دوران میں پیدا ہوا تھا۔ شیخ صاحب اس انتخاب کے ذریعے یہ اعتراض بھی دور کرنا چاہتے تھے۔ اُردو کے کتنے ہی پرچے ان کے پاس آتے تھے اور بیسیوں میرے نام بھی جاری ہوئے تھے۔ محکمے میں جو آتے تھے وہ الگ تھے اور اخبارات کی تو انتہا نہیں تھی۔ شہر میں اس وقت اس ضرورت کے مطابق کوئی لائبریری نہ تھی نہ شاید آج ہے جہاں کوئی قابلِ ذکر اُردو پرچہ یا اخبار آنے سے نہ رہ جاتا ہو۔ خیر انھیں حالات میں کام شروع کر دیا گیا اور ہر ہفتہ دس دن بعد شیخ صاحب کے دولت خانے پر ہم دونوں کی نشست ہوتی جس میں بے حد سختی کے ساتھ میری منتخب کردہ نظموں پر تبادلۂ خیال ہو کر اُن کا دوبارہ انتخاب ہوتا۔ آخر خدا خدا کر کے انتخاب تیار ہوا اور کتابت کو دیا گیا تو شیخ صاحب نے فرمایا کتاب پر مقدمہ وہ خود لکھیں گے۔

ایک دن انھوں نے مجھے سلام بھیجا۔ پہنچا تو فرمایا وہ مقدمہ تیار ہے، اس پر ایک نظر ڈال لوں۔ اب جو میں نے ایک پورا صفحہ پڑھ ڈالا اور جملہ ختم نہ ہوا، نہ خبر نکلی تو میں نے کہا شیخ صاحب یہ آپ نے کیا لکھا ہے؟ اس مضمون

کے کم از کم دو تین حصے تو کر لیں ورنہ مطلب خبط ہو جائے گا۔ فرمایا کہ آپ اس کے پیراگراف بنالیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مگر آگے جب میں ایک اور جگہ اٹکا تو پوچھا اب کیا دقت ہے؟ لکھا تھا کہ ہماری ملی شاعری کا "چراغ لبِ بام" ہے۔ میں نے عرض کیا شیخ صاحب چراغ نہیں آفتاب لبِ بام ہوتا ہے۔ کچھ جھینپ کر کہنے لگے اچھا تو یوں ہی بنا دیجئے۔ آپ لوگ اہلِ زبان ہیں نا؟ مقدمہ کسی نہ کسی طرح درست ہو گیا تو سوال کیا کتاب کس کے نام سے چھپے گی۔ میں کچھ چونکا، عرض کیا محکمے کی طرف سے چھپ رہی ہے کسی کا نام دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر کچھ گول مول انداز میں فرمایا کہ ٹائٹل پر "ا" کا حرف کیسا رہے گا؟ میں سمجھ گیا۔ میں نے کہا تو پورا نام ہی کیوں نہ چھاپا جائے۔ الف سے تو سو لوگوں کے نام ذہن میں آسکتے ہیں۔ کہنے لگے اچھا تو صرف اکرام کافی ہوگا۔

اب تک کچھ "نیمے دروں نیمے بروں" کا سا انداز تھا۔ اب ہمت بڑھ گئی اور بلا کسی تامل کے بولے مگر کام تو آپ نے کیا ہے۔ مقدمے میں اس کا ذکر آنا چاہیئے اور میرے ہاتھ سے کاغذ لے کر اپنے مقدمے کے آخر میں یہ فقرہ بڑھا دیا۔

"جلیل قدوائی صاحب سے نظموں کے جمع کرنے میں ہمیں بیش بہا مدد ملی، اس کا اظہار بھی ہمارا خوشگوار فرض ہے۔"

شیخ صاحب کی بڑی آرزو تھی کہ اُن کی ادبی اور علمی خدمات کا سرکاری طور پر اعتراف ہو۔ چنانچہ وفات سے قبل انھیں پرائڈ آف پرفارمینس کا اعزاز عطا

لہ ابو الاثر حفیظ مرحوم میرے پرانے دوست تھے مگر اہلِ زبان کا طعنہ وہ بھی دیتے تھے۔ ایک بار تقسیمِ ملک سے پہلے ماڈل ٹاؤن میں ملے میں بھی وہیں رہتا تھا۔ دیکھتے ہی بولے "اہاہا! حضرات لکھنؤ تشریف لا رہے ہیں!" اس الزام کو کیسے دور کروں۔ میرا خیال ہے کہ لکھنؤ بدنام تھا یا نہ تھا میں نے اس سلسلے میں ایک کتاب ضرور لکھی ہے "شعرائے بدنام" مگر اہلِ پنجاب ضرور کسی غیر معمولی کمپلکس میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ہو گیا تھا[۱]۔ اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انھیں اعزازی ڈاکٹریٹ بھی مل گئی تھی۔

---

[۱] بعض احباب کو معلوم ہے خصوصاً مشفق خواجہ صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے اُس سال صدر انجمن جناب اختر حسین مرحوم نے راقم کا نام بھیجا تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر منع کیا تھا مگر "کون سنتا ہے فغانِ درویش"! نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔

چراغ حسن حسرت

خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے، یہ تو نہیں کہوں گا کہ وہ کچھ زود غلط قسم کے انسان واقع ہوئے تھے، انھیں اعلیٰ درجے کے صاحبانِ علم وفن نیز تجربہ کار اخبار نویسوں کی صحبتیں میسّر آئی تھیں لہٰذا صاحبِ بصیرت اور اہلِ رائے تھے۔ "شیرازہ" جیسا مفید اور دلچسپ رسالہ اگرچہ مختصر عرصے ہی کے لیے سہی نکال چکے تھے اور صحیفہ نگاری اور کالم نویسی میں اُن کی ایک معقول و مقبول حیثیت مسلم ہو گئی تھی۔ رُعب دار شکل وصورت، شان دار قد و قامت، بہترین شیروانی، گھنی سیاہ مونچھیں، سنبھلی ہوئی چال ڈھال، اُن کے سگریٹ پینے کا خاص انداز اور پُراعتماد طرزِ گفتگو و استدلال، ان تمام باتوں کے سبب خدا نے انھیں ایک مردِ معقول کی صفاتِ وافر سے متصف کیا تھا۔ مگر پھر کہوں گا مجھے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی بابت کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہمی تھی اور اپنے خردوں پر تو بلا وجہ رُعب ڈالنا اُن کی سیرت کا خاص جزو تھا۔ ویسے اپنے ہم عمروں کے ساتھ بشرطِ ضرورت بھولپن اور کسی حد تک نیاز مندی سے مل بیٹھ لیتے تھے۔

میری ان کی چند ہی دنوں کراچی میں ملاقات رہی جب وہ "امروز" کے کراچی ایڈیشن سے منسلک ہو کر تشریف لائے تھے۔ وہ تعلق ختم ہو گیا تو شیخ محمد اکرام نے جو ان دنوں ہمارے جائنٹ سیکرٹری تھے، مجید ملک، ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری وغیرہ کی ایما پر جن کا بوجوہ در وجوہ کراچی میں اُس زمانے میں جمگھٹا ہو گیا تھا حسرت صاحب کو عارضی طور پر ریڈیو سے مناسب اعزازیے کے ساتھ منسلک کر دیا۔ سالک صاحب بھی کچھ نیم سرکاری قسم کے کاموں کے سلسلے میں کراچی میں روک لیے گئے تھے۔ گویا کراچی میں مشہور "نیاز مندانِ لاہور" کا ایک چھوٹا سا گروپ اس وقت موجود تھا۔ انھیں دنوں حسرت صاحب نے کسی کورس (درسی نصاب) کی ریڈریں تیار کی تھیں اور کسی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں اور شان الحق حقی (جو علی گڑھ میں میری شاگردی کے رشتے سے اپنی مہربانی سے مجھے برابر "استاذی" لکھتے ہیں اور حسرت صاحب

سے یہ بات کسی نے بتا دی تھی) اس کمیٹی کے رکن ہیں جو ریڈرین منتخب کرے گی۔ چنانچہ میرے پاس میری رائے اپنے حق میں حاصل کرنے کے علاوہ حقی صاحب کو میرے ذریعے متاثر کرنے کی کوشش کے لیے تشریف لائے۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں یقین دلایا کہ شان صاحب رکن ہوں تو مجھے معلوم نہیں مگر اس خاکسار کا کسی ایسی کمیٹی سے تعلق نہیں نہ شان صاحب ایسے معاملات میں میری یا کسی کی سفارش قبول کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک معاملے میں کسی نے اُن سے خود میری سفارش کی تھی وہ بھی نہیں قبول کی۔

ایک بات مجھے آج تک نہیں معلوم ہوئی کہ وہ یعنی حسرت صاحب مولانا بلکہ "مو لُنا" کیوں کہے جاتے تھے نیز یہ کہ دوسروں کو بھی وہ اسی لفظ سے یعنی مخاطب کے نام کے بغیر صرف "مو لُنا" سے کیوں پکارتے تھے۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جن کی صرف مونچھیں تھیں ڈاڑھیاں نہیں تھیں۔ ڈاڑھیاں بھی ہوتیں تو شاید پورے مولانا کہلائے اور کہے جاتے (حالانکہ میں نے رازق الخیری مرحوم کے سفرنامے میں پڑھا کہ انھوں نے مشرقِ وسطیٰ میں کئی جگہ بغیر ڈاڑھی مونچھ اور ننگے سر والے مولاناؤں کی امامت میں نمازیں پڑھیں)۔

بہرحال یہاں میں حسرت صاحب کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ جو اس مضمون کے پہلے پیرے کے آخری حصے میں بیان کردہ ان کی ایک صفت سے متعلق ہے بیان کرنا چاہوں گا جو میرے دل میں ہر وقت کھٹکتا رہتا ہے اور اس وقت باہر آنے کے لیے بے چین ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ حسرت صاحب اور ایک نوجوان صاحبزادے کے درمیان پیش آیا تھا۔ میں صاحبزادے کا نام نہیں لیتا۔ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے واقعۂ مذکور کے بعد شعر و ادب کی دنیا میں اُنھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ مگر اس زمانے میں کراچی ریڈیو میں اُن کے ابتدائی ایام تھے اور وہ حسرت صاحب کے ماتحت تھے۔

ایک بار کسی کام سے مجھے دفتر کے اوقات میں حسرت صاحب کے پاس جانے کا اتفاق ہوا یا شاید انصار ناصری کے پاس گیا تھا وہاں سے اُٹھ کر حسرت صاحب کے پاس آبیٹھا۔ میں نے دیکھا وہ اپنی شان دار کرسی پہ ایک بڑی سی میز کے ساتھ بڑے کروفر بلکہ پورے پھیلاؤ کے ساتھ

بیٹھے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے ہوئے اپنے اس نیاز مند آرٹسٹ کو شرم دلا رہے تھے کہ اُس نے پچھلی رات کا فیچر والا یہ پروگرام زیادہ شاندار اور دلچسپ طریق پر پیش نہیں کیا۔ اُن کے خیال میں کچھ نہ ہوتا تو پروگرام کے لیے ایک مناسب فضا پیدا کرنے کی غرض سے کم از کم ابتدا میں چند اچھی کافیاں کسی اور کی تو کیا حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ جیسے بزرگ کی گوا لی گئی ہوتیں پھر دیکھتے پروگرام کتنا شاندار ہوتا!

اس کے بعد حضرت نے پروگرام کی زبان پر اعتراضات شروع کیے اور صاحبزادے صاحب سے پوچھا اُردو میں اُن کے خیال میں کس اہلِ قلم کے اسٹائل کی نقل اس پروگرام کے لیے بہترین ہوتی۔ جب ان صاحبزادے نے غالباً موصوف کو اپنا حاکم اعلیٰ سمجھتے ہوئے جواب دینے میں ذرا غور اور تامل سے کام لیا تو حسرت صاحب نے اپنے سیدھے ہاتھ کو پوری لمبائی کے ساتھ پھیلا کر جس کی انگشتِ شہادت میں سگریٹ تھامے تھے، اُس سے دور پر دیوار سے لگی ہوئی لکڑی کی ایک شلف کی طرف اشارہ کر کے جس کے سبھی خانوں میں کتابیں سجی ہوئی تھیں، فرمایا وہ جو تیسرے خانے میں دسویں نمبر پر موٹی سی کتاب رکھی ہے، اسے آپ جانتے ہیں کون سی ہے؟ اسے نکال کر لے آئیں۔ وہ نکال کر لائے تو مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" تھی۔ فرمایا "محمد حسین آزاد، محمد حسین آزاد! آپ نے اس کا نام سنا ہے؟ یہ شخص ہے جس نے مجھے اور مجھ سے بڑے بڑے لوگوں کو اُردو لکھنی سکھائی۔ اسے کاش آپ بھی کبھی کبھی اس کا مطالعہ کرتے رہا کریں۔"

میں چپکا بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ شاید حسرت صاحب کو خیال آیا کہ انھوں نے اب تک میرا نوٹس نہیں لیا تھا اور از راہِ مہربانی اب نہ صرف مجھے سگریٹ پیش کی (جو میں نے واپس کر دی اس لیے کہ ان دنوں پینا ترک کرنے کی کوشش کر رہا تھا[1]) بلکہ یہ بھی دریافت کیا کہ جو کچھ اُنھوں نے اب تک فرمایا تھا اس کے بارے میں میری کیا رائے تھی؟ مجھے اپنا یہ دخل در معقولات

---

[1] اب ترک کر چکا ہوں بلکہ بہ کثرت سگریٹ نوشی کی سزا بھی بھگت رہا ہوں۔

اچھا نہیں معلوم ہوا مگر کچھ کہے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے محمد حسین آزاد کی اردو کے بارے میں ان کے خیال سے پورا پورا اتفاق کیا بلکہ اس میں اتنا اضافہ کیا کہ جب میں علی گڑھ میں تھا تو اپنے طلبہ میں زبان اور شعروادب کا سچا ذوق پیدا کرنے کے لیے ابتداءً دو کتابوں کے مطالعے کی سفارش کرتا تھا، آبِ حیات اور یادگارِ غالب۔ اس پر حسرت صاحب نے از راہ مہربانی میرے مذاقِ سلیم کی داد دی۔

رہا کافیاں گوانے کا قصہ تو میں اس کوچے سے بالکل نابلد تھا اور وہ صاحبزادے حسرت صاحب سے کہہ رہے تھے کہ حضرت زکریا ملتانیؒ کی کافیاں باوجود تلاشِ بسیار انھیں فراہم نہیں ہوسکیں۔ اس پر میرے منہ سے نکل گیا کہ کراچی میں ملتان شریف کے پیر مغاں حضرت اسد ملتانی موجود ہیں (افسوس مدت ہوئی مرحوم ہو گئے۔ اس وقت ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی وزارت میں اسسٹنٹ سیکرٹری تھے) ان سے رابطہ قایم کر لیا ہوتا۔

اتنا سننا تھا کہ معلوم ہوا میں نے حسرت صاحب کے دل کی بات کہہ دی اور وہ اپنے ریڈیو آرٹسٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ہائے مگر ان سے اتنی ذرد سری کہاں ہوسکتی تھی!" جب مجھ سے حسرت صاحب کو معلوم ہوا کہ اتفاق سے ان کے پاس سے اٹھ کر میں اسد صاحب ہی کے پاس ایک کام سے جانے والا تھا اور وہ کام سرکاری تھا اور اسٹاف کار بھی میرے پاس موجود تھی تو انھوں نے میرے ہمراہ اسد صاحب کے پاس تشریف لے چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

میں نے ہم دونوں کی ان کے پاس اک ساتھ آمد کے ارادے کی پیشگی اطلاع دینے کے خیال سے حسرت صاحب کے میز پر رکھے ہوئے فون کے ذریعے سے فوراً اسد صاحب سے بات کی اور تمہیدیا پس منظر کے طور پر سارا قصہ سنایا تو انھوں نے ملتانی کافیوں کے بارے میں ہم دونوں کی ناواقفیت پر بے حد تعجب کا اظہار کیا۔ ہمارے ان کے پاس پہنچنے کے ارادے پر تو انھوں نے مسرت کا اظہار کیا بلکہ فرمایا ہم جلد آئیں کیونکہ وہ کھانا کھانے بیٹھ رہے ہیں اور ہم دونوں بھی شریکِ طعام ہوں تو انھیں مسرت ہوگی۔ مگر ساتھ ہی یہ اطلاع دی

کہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے تو کوئی کافی نہیں کہی بلکہ کافیوں کا زمانہ تو ان کی وفات کے کوئی سو برس بعد کا ہے!!

اب حسرت صاحب نے اسد صاحب کے پاس جانا ملتوی کر دیا اور مجھ سے کافیوں کے بارے میں مؤخر الذکر سے حاصل کی ہوئی معلومات کا پتہ چلنے پر بلا کسی رسمی تکلف یا حیلے حوالے کے اُن صاحبزادے کو تو رخصت کر دیا اور معمول سے بھی زیادہ زور دار انداز سے سگریٹ پینے میں مشغول ہو گئے۔

میں اُنھیں دیکھتا رہ گیا اور وہاں سے چل پڑا۔ وہ بھی مجھے دیر تک دیکھتے رہ گئے۔

رگھوپتی سہائے فراق

الہ آباد میں دو ایک بار اصغر صاحب کے دولت کدہ پر فراق صاحب سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اُن دنوں اول الذکر ہندستانی اکیڈمی[1] یو پی میں اُردو سہ ماہی "رسالہ ہندستانی" کے مدیر تھے۔ میں نے انھیں صاف ستھرے فرش پر دو زانو بیٹھے اصغر صاحب سے احترام کے ساتھ گفتگو کرتے پایا۔ اُن کی بڑی بڑی گول گول ہر طرف گھومنے والی آنکھیں ایسا ظاہر کرتی تھیں جیسے وہ کسی چیز کی تلاش میں ہوں۔ اس وقت اُن کے شعر و سخن کا اتنا چرچا نہیں تھا۔ میری ان کی دوستی اصل میں ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی جب میں علی گڑھ سے دو سال کی طولانی رخصت لے کر اردو میں ایم اے کرنے الہ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔

وہ پروفیسر امرناتھ جھا، وائس چانسلر[2] کی طالب علمی کے زمانے میں اُن کے ساتھی تھے مگر کانگریس کے چکر میں پھنس کر انھوں نے اپنی عمر کے کئی سال ضائع کر دیے، پھر تعلیم و تدریس کی طرف واپس آئے۔ وہ یونیورسٹی

---

[1] اس اکیڈمی نے ۱۹۳۶ء میں میرا مرتبہ "دیوان بیدار" شائع کیا تھا جو مرزا مسعود سے منسوب تھا اور اب نایاب ہے حتیٰ کہ میرے پاس بھی اپنی کوئی جلد نہ رہ سکی۔ اب وہ جامعہ کراچی کے ایک مہربان کے پاس ہے۔ مگر میری خوش قسمتی دیکھیے کہ میرے ایک دوسرے ہندستانی مہربان مشہور و معروف ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اس کی وہ جلد جو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی مملوکہ اور دستخط شدہ تھی اور انھوں نے مختار صاحب کو عطا کی تھی مجھے نذر کر دی۔ یہ طولانی قصہ ہے جسے زندگی شرط کسی آئندہ موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ اس میں عرشی رام پوری، ڈاکٹر امتیاز علی تاج مرحوم نیز شفیق خواجہ جیسے دوستوں کے نام بھی آنے ضروری ہیں جن کا بہت ممنون ہوں۔

[2] امرناتھ سے پہلے اُن کے والد عالم و فاضل ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا بھی الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے تھے۔

میں انگریزی زبان و ادب کے نہایت قابل استاد اور طلبا و اساتذہ میں یکساں مقبول تھے نیز انھوں نے اُردو شعر و ادب کی خدمت گزاروں میں اچھا نام پیدا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو کی کلاسیکی شاعری کے ایک کامیاب نباض ہونے کے باوجود وہ اپنا ایک جدا رنگ رکھتے تھے جو آنا فانی تھا۔ اُنھوں نے حالی کی شاعری کو "بدن چور" کہا ہے مگر خود اُن کی غزل میں حیاتی رنگ شاید ہی کہیں نمایاں ہو۔ اُن کے اندازِ بیاں میں کہیں کہیں بے ساختگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ غزل کی شائستگی اور گھلاوٹ بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ آخر غزل پر یہ جبر کیوں؟ وہ نوجوانوں میں بہت مقبول ہوتے۔ مگر یہ کیا بات ہوئی کہ پرانے شعرا دو غزلہ، سہ غزلہ اور چہار غزلہ تک لکھتے تھے۔ انھوں نے غزل کو شیطان کی آنت بنانے کی طرح ڈالی یعنی ایک ہی غزل میں اشعار کی بھر مار کر دی اور پھر پڑی، کڑی، سڑی وغیرہ جیسے قافیوں میں ؎

اڑنگے کیوں لگاتے ہیں شریفوں کی محبت میں
لفنگوں کو ہمارے پاس آنے کی پڑی کیا تھی!

لیکن حق یہ ہے کہ ان کے ایسے اشعار کو اُردو شاعری میں ابدی مقام ملنا چاہیے ؎

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا	اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے
کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی	اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں	اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

فراق کو ایک وصف میں کمال حاصل تھا۔ وہ کسی مجلس میں خاموشی سے، یعنی

ع اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے (ریاض)

پہنچتے اور ایک گوشے میں بیٹھ جاتے مگر ظاہر ہے کہ بمصداق

ع ہم سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

پہچانے اور پکڑے جاتے اور ان کے پوربی لہجہ میں یہ کہے جانے کے باوجود کہ "ارے ہم یہاں آتے گئے یہ بہوت ہے۔" مجلس کے بیچوں بیچ بٹھا دیئے جاتے۔ اب وہ تھوڑی دیر کے لیے بھونچکے سے بنے اپنی متحیر نظریں چاروں طرف دوڑاتے اور اس پر توجہ دیتے کہ مجلس میں موضوعِ بحث کیا ہے۔ ذرا دیر میں وہ کوئی ایک فقرہ بول دیتے، پھر تو آہستہ آہستہ وہ حاضرین پر اس طرح چھا جاتے

کہ کسی اور کو بولنے کی تاب نہ رہتی۔ کچھ دیر بعد آپ دیکھتے کہ بالکل غیر محسوس طور پہ مجلس کا رنگ اور موضوع سخن ہی بدل گیا ہے حاضرین کو سانپ سونگھ گیا ہے اور فراق صاحب خود اپنے کسی پسندیدہ موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں!

وہ بنک روڈ پر بڑے ٹھاٹھ سے تنہا رہتے تھے۔ بیوی سے اختلاف تھا۔ ایک مہرا اُن کا سارا کام بڑے سلیقہ سے انجام دیتا تھا۔ سارا گھر ضروری (شاید بعض غیر ضروری) سامان سے سجا ہوا تھا۔ کمروں میں ہر طرف صفائی کی جھلک نظر آتی تھی۔ پریم چند سے میری ملاقات انھیں کی قیام گاہ پر ہوئی تھی جو اُن کے بڑے دوست تھے اور ان کے پاس بنارس سے آتے اور قیام کرتے رہتے تھے دبلے پتلے بلکہ سوکھے ساکھے تھے مگر بڑے زندہ دل تھے اور بات بات پر زور دار قہقہہ لگاتے تھے۔[1]

---

[1] ایک ملاقات میں میں نے موصوف سے شکایت کی کہ وہ اُردو میں لکھتے لکھتے اور اتنی شہرت حاصل کرنے کے بعد اس کی طرف سے منہ موڑ کر ہندی کی طرف کیوں ڈھلک گئے۔ میں نے دیکھا کہ اپنی تمام زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے باوجود میرے اس سوال پر وہ سنجیدہ ہو گئے اور اُردو ناشران اور کتب فروشوں خاص کر لاہور کے ایک دار الاشاعت کو ایک موٹی سی گالی دے کر بولے کہ دو دو سال تک حساب نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ کی کتابوں نے گودام میں جگہ گھیر رکھی ہے۔ دس بکی ہیں۔ کمیشن اور ڈاک خرچ وضع کرنے کے بعد بقیہ پیسے ڈاک سے بھیج دیئے جائیں یا آپ کے حساب میں کوئی کتاب بھیج دی جائے۔ ایک کتاب کی اشاعت میں دس دس سال لگ جاتے ہیں کیوں کہ ایک ہزار دکھاتے ہیں اور پانچ ہزار چھاپتے ہیں اور چوری چوری بیچتے رہتے ہیں۔ اب ہندی میں دس ہزار چھپتی ہیں اور سال بھر کے اندر ایڈیشن ختم ہو جاتا ہے۔ اب پہلے ہندی میں لکھتا ہوں، خوشامد کرتے ہیں تو اردو میں ترجمہ کرتا ہوں۔ گئودان پہلے ہندی میں لکھی گئی پھر اُردو میں وہ "چوگان ہستی" کے نام سے بازار میں آئی۔ میری ایک غزل لے گئے تھے "آپ کو میری وفا یاد آئی" اپنے کسی ناول میں ٹانکی ہے۔ چومے جلنے کے قابل شخص نہ تھا۔

فراقؔ نے راقم سے اپنے کلام کے ایک مجموعہ کی لاہور سے اشاعت کا انتظام کر دینے کی فرمائش کی تھی۔ نہ جانے کیسے انھیں یہ خوش فہمی ہوئی کہ میں یہاں کے پبلشروں کو متاثر کر سکتا تھا حالانکہ میں تو ان میں سے کسی کو بھی جانتا نہ تھا۔ یہ امر تعجب خیز ہے خاص طور پر جب کہ میں اطلاعات سے متعلق تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ ذاتی کاموں کے لیے میں خود ہمیشہ دوسروں کا محتاج رہا اور ہوں۔ ویسے بھی جہاں تک مجھے علم ہے یہاں اور وہاں کے کم از کم کتب فروش قسم کے لوگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں چنانچہ میں ان کا کام نہ کر سکا

اُن سے میری آخری ملاقات کراچی کے اُس پاک۔ ہند مشاعرے میں ہوئی تھی جو عظیم الدانؔ[1] مشاعروں کا سلسلہ بند ہونے کے بعد ایک بار غالباً بعض تجارت پیشہ اصحاب کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ یہ کوئی چالیس برس ادھر کا قصہ ہے جس کے بعد میں نے مشاعروں میں جانا ترک کر دیا۔ بڑی افراتفری ہوتی تھی۔ اس مشاعرہ کی صدارت نیازؔ صاحب نے کی تھی جو کچھ دن پہلے سے پاکستانی بن کر کراچی میں مقیم ہو چکے تھے۔ جوشؔ، اثرؔ اور فراقؔ اس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے آئے تھے۔ حفیظؔ نے ان کے استقبال میں اپنی مخصوص قسم کی نثر میں تحریری تقریر پڑھی تھی۔ زہرہ نگاہ نے شاید پہلی بار اپنی غزل سنائی تھی اور ایسے پُر اعتماد لہجہ اور لحن داؤدی میں کہ مشاعرہ لوٹ لیا۔ فراقؔ کی رباعیات بھی کچھ کم مقبول نہیں ہوئیں مگر اُن کی کامیابی میں اُن کے ڈرامائی انداز اور نسرت یا بھاؤ کو زیادہ دخل تھا۔ ایسا سماں بندھا اور بار بار داد کے ڈونگروں نے وہ لطف دیا جیسے رات کے سناٹے میں وقفہ وقفہ سے جھما جھم پانی برس رہا ہو۔

---

[1] اخبار "ڈان" کے زیر انتظام مسلسل کئی سال کراچی میں بڑی شان سے پاک۔ ہند مشاعرے منعقد ہوتے۔ "جنگ" کے منتشی اور یادگار کالم نویس میرے محبوب دوست مرحوم مجید لاہوری نے ان مشاعروں کی تعریف میں یہ انوکھی اصطلاح وضع کی تھی۔

ضمیمہ

راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان (رجسٹرڈ)

سرپرست

۱۔ جناب ابرار حسن خاں، کراچی (رکن منتظمہ)
۲۔ جناب حمید، ڈی، حبیب، کراچی

معطیان

۳۔ جناب حکیم محمد سعید، ستارۂ امتیاز، کراچی
۴۔ بیگم سلطانہ اکبر مسعود، کراچی (خازن)
۵۔ بیگم انجم عباسی، کراچی
۶۔ جناب سید انور مسعود، دوبئی (متحدہ عرب امارات)
۷۔ جناب ڈاکٹر احسان رشید، کراچی
۸۔ جناب مقبول احمد قدوائی، آٹووا (کناڈا)

اعزازی ارکان دوامی

۹۔ جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، کراچی

۱۰۔ جناب سید ہاشم رضا، کراچی
۱۱۔ جناب مشفق خواجہ، کراچی
۱۲۔ پروفیسر مسیح الدین احمد صدیقی۔ اسلام آباد

ارکان عمومی

۱۳۔ جناب جلیل قدوائی، کراچی (معتمد اعزازی)
۱۴۔ بیگم ہرمزی قدوائی، کراچی (رکن منتظمہ)
۱۵۔ ڈاکٹر مسز پروین بشیر احمد، کوونٹری (انگلستان)
۱۶۔ جناب خورشید حسن میر، راولپنڈی
۱۷۔ جناب آر۔ ڈبلیو۔ نوبل، لندن (انگلستان)
۱۸۔ جناب اشفاق الرب سائل، کراچی
۱۹۔ جناب سید سعید جعفری، کراچی (صدر)
۲۰۔ جناب ڈاکٹر سید انعام احسن، کراچی
۲۱۔ جناب حسن احمد شاہ، حیدر آباد
۲۲۔ جناب عرفان علی بیگ مرزا، کراچی
۲۳۔ جناب حاجی فریدالدین صدیقی، حیدر آباد
۲۴۔ جناب عبدالجلیل صدیقی، حیدر آباد
۲۵۔ جناب سید عبدالقیوم، کراچی
۲۶۔ جناب شجاع احمد زیبا، کراچی (شریک معتمد)
۲۷۔ جناب شاہ انجم، حیدر آباد